© rasailojaraid.com

اسلام اور مغرب: موجودہ مسائل اور مسلمانوں کا ردِ عمل *

پروفیسر خورشید احمد

اسلام اور مغرب کے تناظر میں موجودہ مسائل اور ان پر مسلم ردعمل ایک وسیع لیکن غیر معمولی اہم موضوع ہے۔ اس پر گفتگو کا مقصد خود کلامی نہیں ہے بلکہ میں چاہتا ہوں کہ اسے ایک دوطرفہ تبادلۂ خیالات کی شکل دی جائے اور مسلمانوں کو درپیش مسائل کے حوالے سے ان سوالات کے حل تلاش کیے جائیں جو اکثر اہلِ دانش کو دعوت فکر دیتے ہیں۔ میں چاہوں گا کہ مختصر ترین وقت میں آپ کے سامنے موضوع کے تعارف کے طور پر بنیادی نکات رکھ دیے جائیں اور پھر آپ کے استفسارات اور تعلیقات کی روشنی میں گفتگو کو اس کے منطقی نتیجہ تک پہنچایا جائے۔

میں اپنی بات کا آغاز قدرے مختلف انداز میں کر رہا ہوں کیونکہ موجودہ فضا محاذ آرائی سے پوری طرح آلودہ ہے۔ اگرچہ یہ نئی بات نہیں ہے لیکن ۹/۱۱ کے بعد سے نہ صرف مباحثوں بلکہ رویوں پر بھی صلیبی حربی روح غالب نظر آتی ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ ۹/۱۱ کے واقعے کے فوراً بعد اس وقت کے امریکی صدر جارج بش نے کہا تھا کہ یہ صلیبی جنگ جاری رہے گی۔ اگرچہ اس کے بعد کافی وقت اس کی وضاحت میں ضائع کیا گیا یعنی اس سے اس (بش) کی کیا مراد تھی۔ لیکن میرا یہ خیال ہے کہ خواہ یہ فرائیڈ (ماہر نفسیات) کا بیان کردہ زبان کا پھسلنا ہی کیوں نہ ہو، ایک خاص ذہنیت کو آشکار کرتا ہے۔

---

* انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز میں منعقدہ ایک سیمینار میں پروفیسر خورشید احمد صاحب کی تقریر کو انگریزی سے اُردو میں ترجمہ اور مناسب ادارت کے ساتھ یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ سیمینار ۲۱ مارچ ۲۰۱۲ء کو منعقد ہوا۔ جس کی صدارت جناب محمد اکرم ذکی نے کی۔ باشین میں ڈاکٹر نذیر حسین اور ڈاکٹر سفیر اعوان شامل تھے۔ شرکاء میں اسلام آباد کے دانشور، اہلِ علم، یہاں کی جامعات کے اساتذہ اور طلبہ بھی شامل تھے۔ انگریزی سے اردو ترجمہ منزہ صدیقی اور فہد کیہر نے کیا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہی معاملہ اس کے ردِعمل کا بھی ہے۔ فطری طور پر جہاں بعض رویے انتہائی نپے تُلے اور معقول ہیں وہیں بعض ردِعمل جھنجھلاہٹ کا اظہار اور 'ادلے کا بدلہ' جیسا معاملہ نظر آتے ہیں۔ چنانچہ اس تناظر میں، میں اپنا نقطۂ نظر قدرے مختلف انداز میں پیش کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اگر ہم اسلام اور مغرب کے درمیان چودہ سوسالہ تعلقات پر نظر ڈالیں تو آپ کو دو متوازی منظر نظر آئیں گے۔ ایک منظر محاذ آرائی والا ہے۔ جو صلیبی جنگوں، نوآبادیاتی نظام، ابتداً اسلام کی ایسی تصویر کشی جیسے یہ عیسائیت سے ماخوذ ہے یا پھر عیسائیت دشمن نظریات وغیرہ سے آلودہ ہے۔

مگر ایک دوسرا منظر بھی ہے جو غالباً بہت زیادہ نمایاں نہیں ہے اور وہ ہے ہماری بات چیت، مکالمے، مقابلے اور تعاون کا منظر۔ چنانچہ ہمارے سامنے دو متوازی نمونے ہیں۔ ایک (کسی بہتر لفظ کی عدم موجودگی کی وجہ سے) ''تہذیبوں کے تصادم'' کا ہے اور دوسرا تاریخ میں کسی نہ کسی شکل میں ہم رکابی یا تعاون کا ہے۔ چنانچہ میں خود اپنے آپ کو بھی اور آپ سب کو بھی یاد دلاتا چلوں کہ یہ ہجرت کے ساتویں سال یکم محرم کا واقعہ ہے جب نبی محترم صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف سربراہانِ مملکت کو خطوط لکھے جن میں بازنطینی، ایرانی اور دوسرے جارح ممالک شامل تھے۔ اسی طرح ایک خط ہراقلیس کو بھیجا گیا جس کی تاریخ یکم مئی ۶۲۸ء اور یکم محرم ۷ ہجری ہے۔ یہ بڑی دلچسپ بات ہے کہ ایران اور بازنطینی سلطنت سے آنے والے ردِعمل کافی مختلف تھے۔ چنانچہ ہمارے تعلقات کی یہ نوعیت بھی رہی ہے۔ ہمارے درمیان تجارت، تعلقات میں اضافہ، دعوتی وفود کا تبادلہ، ایک دوسرے کے تجربات سے فائدہ اٹھانا، ایک دوسرے پر اثر انداز ہونا یہ سب کچھ بھی برابر چلتا رہا ہے جو بعض اوقات نظر انداز ہوا اور کبھی گہنا گیا۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ آج پھر ہم ایسی ہی صورتِ حال سے دوچار ہیں۔ اختلاف اور تعاون – دونوں ہی افق پر واضح ہیں، دونوں ہی ممکنات ہیں اور جو پسند ہماری ہے – یہ پسند 'اُن' کی بھی ہے۔ یہ ہم پر منحصر ہے کہ عالمی صورت حال کو نظر میں رکھتے ہوئے ہمیں کس طرزِ عمل کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔

دوسرا نکتہ جو میں آپ کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں کہ بظاہر ہم سب 'اسلام اور مغرب' کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عنوان سے مطمئن ہیں لیکن اگر ہم غور کریں تو ہمیں یہ سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے کہ کیا ان میں تقابل ہو بھی سکتا ہے؟ اسلام تو ایک پیغام ہے، دنیا کے بارے میں ایک نقطۂ نظر، اقدار اور اصولوں کا مجموعہ، طرزِ عمل، زندگی گزارنے کا ایک طریقہ، ایک معاشرہ، ایک ریاست، ایک تہذیب، ایک معاشرت۔ یاد رہے، خیالات و نظریات کو بیان کرنے کے لیے زمان و مکان کی ضرورت ہوتی ہے۔ جغرافیائی پہلو بھی اہمیت رکھتا ہے ہم ان دونوں (نظریات اور جغرافیہ) کو مکمل طور پر الگ نہیں کر سکتے۔ اسلام اپنی فطرت میں اگرچہ ان سب چیزوں کا مجموعہ ہے لیکن یہ محض مشرق و مغرب شمال و جنوب یا کسی خاص محل وقوع اور معاشرت تک محدود نہیں ہے۔ اسلام عالمگیر ہے نہ صرف نظریاتی بلکہ تاریخی اور سماجی اعتبار سے بھی مسلمانوں کا وجود دُنیا کے ہر حصے میں رہا ہے۔ خاص طور پر ہم یہ بات محسوس کرتے ہیں کہ آج جب مسلمانوں کا دوسری قوموں کے ساتھ میل جول ہوتا ہے یا وہ محض سیاحت کے طور پر جاتے ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ وہاں ہمیشہ سے مسلمانوں کی موجودگی رہی ہے حتیٰ کہ نبویؐ دور اور خلفائے راشدین کے زمانے میں بھی اسلام چین اور اسی طرح افریقہ اور وسطی ایشیا تک پہنچ چکا تھا۔

خاص طور پر بیسویں صدی کے دوسرے نصف میں، پہلی بار ایسا ہوا کہ عالمی طور پر آبادی کے ایک بڑے حصے کی اِدھر اُدھر منتقلی ہوئی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یورپ اور امریکہ میں اسلام آج دوسرا بڑا مذہب ہے، وہاں مسلمانوں کی کافی بڑی آبادیاں موجود ہیں جو محض تارکینِ وطن، کارکن یا مہمان کارکن نہیں ہیں بلکہ اب وہ پہلی، دوسری اور تیسری نسل ہیں۔ چنانچہ یہ عالمگیر پہلو بہت اہم ہے۔ لیکن جب ہم مغرب کی بات کرتے ہیں، ابتداً تو یہ ایک جغرافیائی نظریہ ہے۔ ہم عالمی نقشے پر ایک خاص علاقے کی بات کر رہے ہوتے ہیں۔ یہ اس اعتبار سے تو درست ہے کہ خاص طور پر پچھلی چھ صدیوں سے طاقت کا مرکز اور رُو بہ عروج طاقت یورپ اور پھر امریکہ رہے ہیں۔ نوآبادیاتی نظام کے چار سو سال وہ ہیں جب یورپ کی گلوبائزیشن ہوئی لیکن نوآبادیاتی اور سامراجی شکلوں میں، پانچ بڑی یورپی سامراجی طاقتوں کی اٹھارویں اور انیسویں صدی میں اور روس اور امریکہ کی بعد میں۔ تاہم جغرافیائی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

محل وقوع بھی اہمیت کا حامل ہے۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جب مغربی تہذیب کے عروج کی بات کی جاتی ہے تو یہ ایک نقطۂ نظر، اقدار کے مجموعے، ایک سیاسی نظام اور معاشی اقتدار کی بھی نمائندگی کرتی ہے۔ معاشی، سیاسی یا عسکری اعتبار سے مغربی طاقتیں جہاں کہیں بھی گئی ہیں وہ نہ تو مکمل طور پر ضم ہوئی ہیں اور نہ مکمل طور پر مقامی آبادی کا حصہ بنی ہیں۔ اس کے برعکس اسلام جہاں کہیں بھی گیا، اپنی شناخت، اپنے آفاقی مزاج اور اپنے اندرونی پہلوؤں کو برقرار رکھتے ہوئے یہ مقامی آبادی اور خطے کا حصہ بن گیا اور اس سطح پر کوئی اجنبیت نہ رہی۔ جہاں ایک طرف نظریات، اقدار اور اصول مغربی تہذیب کی شان ہیں وہیں دوسری طرف اسلام کا آفاقی مزاج ہے اور یہ دونوں ہی دنیا کے دوسرے حصوں پر اثر انداز ہوئے ہیں اور انہوں نے اپنا راستہ نکالا ہے۔ یہاں ایک بہت لطیف سا فرق ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ 'ہم اور تم' کا امتیاز ہمیشہ موجود رہا ہے۔ 'ہم سب' کا پہلو یا تو سرے سے موجود ہی نہیں ہے یا تغیر پذیر (گھٹتا بڑھتا) رہا ہے۔ چنانچہ جب ہم مغرب اور اسلام کا موازنہ کرنے چلے ہیں تو اس امر کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

اب ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے سامنے ایک طرف تو یورپی و امریکی سیاسی، ثقافتی اور تہذیبی نظام ہے جس میں جغرافیہ کی اہمیت زیادہ ہے تاہم اقدار اور اصولوں کا اپنا مقام اور اپنی جگہ ہے۔ دوسری طرف جب ہم اسلام کی بات کرتے ہیں تو ہم سب سے پہلے اور بنیادی طور پر ایک نقطۂ نظر، ایک عقیدے، ایک نظریے، ایک طرزِ زندگی اور ایک تہذیب کی بات کر رہے ہوتے ہیں اس کے بعد سیاسی، جغرافیائی محل وقوع کی بھی بات ہوتی ہے۔ ہم یہ بات نو آبادیاتی نظام کے بعد پیدا شدہ صورت حال کے تناظر میں کر رہے ہیں۔ جب کہ مسلمانوں کی ۵۷ خود مختار مسلم ریاستیں، تقریباً نو سو ملین سے ایک بلین کی آبادی، نیز پوری دنیا میں پھیلی ہوئی ایک سو سے زیادہ مسلم آبادیاں جن کی تعداد تقریباً چار سو ملین سے پانچ سو ملین کے درمیان ہے۔ چنانچہ زمین کے اتنے بڑے حصے پر اور پھر دنیا کے دوسرے حصوں میں بھی مسلمان موجود ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہم 'اسلام اور مغرب' کے معاملے پر بحث کر رہے ہوتے ہیں تو یہ دونوں پہلو ضرور سامنے رہتے ہیں، انہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا یعنی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مسلم دنیا کے ساتھ معاملات بطور ایک سیاسی وحدت کے۔ گو مسلم دنیا ۵۷ سیاسی طور پر آزاد ممالک پر مشتمل ہے لیکن جب بات مغرب کے ساتھ تقابل کی ہو تو مغرب ان ممالک کی بھاری یا ہلکی اسلامیت کو نظر انداز کرتے ہوئے انہیں یکساں خطرے کے طور پر دیکھتا ہے۔

ایک دوسرا پہلو جسے پیشِ نظر رکھنے کی ضرورت ہے، اس کا تعلق ماضی قریب کے حوالے سے ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ سب کے علم میں ہوگا کہ مغرب میں بھی حقائق بیان کرنے کا کوئی ایک اسلوب نہیں ہے۔ مغربی مفکرین، تاریخ دان اور دفاعی ماہرین جس طرح سے اسلام کو دیکھتے ہیں یا اسے پیش کرتے ہیں، اس کے خلاف بہت سی تنقیدی آوازیں اٹھ رہی ہیں جو اس امر پر نظر ثانی کی کوشش کر رہی ہیں۔ اس کے باوجود، یہ حقیقت ہے کہ نمایاں حیثیت اس نقطہء نظر کو حاصل ہے جو مخالفت، دشمنی، جہالت، غلط تصویر کشی، اسلام کو مسخ کرنے، بے تعلقی اور عداوت پر مبنی ہے اور عمومی طور پر ان ناقدین کی روحانی ہمدردی بھی عیسائی مشنری علماء، مستشرقین اور اب ان سیاسی تجزیہ نگاروں کے ساتھ ہے جو ذرائع ابلاغ میں پھیل چکے ہیں۔ یہ امر واضح ہے کہ تنقیدی اور مخالفانہ نقطہء نظر ہی زیادہ نمایاں ہے۔ حال ہی میں کیے گئے کچھ سروے، خاص طور پر 'مذہب اور معاشرہ' کے نام سے کی گئی سروے کی ایک سیریز سے اس تلخ حقیقت کا اندازہ ہوتا ہے کہ ایک طرف تو۔ ایک عام آدمی کے اندازے کے مطابق ۵۲ سے ۷۰ فی صد لوگوں کا کہنا ہے کہ ہم اسلام سے ناواقف ہیں اور اس کے باوجود ۵۰ فیصد سے زائد لوگ یہ کہتے ہیں کہ اسلام تشدد پسند ہے، اسلام دوسرے مذاہب کے ساتھ نہیں چل سکتا، یہ جمہوریت اور جدیدیت کا ساتھ نہیں دے سکتا اور یہ بھی کہ تشدد اسلام کا امتیازی نشان ہے۔ ایک طرف تو لاعلمی اور اس کے ساتھ یہ رویہ! اور اعداد و شمار یہ ظاہر کرتے ہیں کہ اس لاعلمی اور جہالت کی بنا پر نہ تو کوئی شرمندگی ہے اور نہ ہی معلومات کی اس خلیج کو پُر کرنے کی کوئی کوشش۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اگر ایسے ہی سروے مسلم دنیا میں منعقد کروائے جائیں تو نتیجہ بہت مختلف ہوگا لیکن میرا خیال ہے کہ اس پہلو کو بھی ذہن میں رکھا جانا چاہیے۔

ماضی قریب میں ہونے والا نوآبادیاتی نظام کا تجربہ بھی سامنے ہے جہاں سیاست اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مذہب ایک دوسرے کے مددو معاون اس طرح سے تھے کہ ان دونوں کے درمیان فرق کرنا ہی مشکل ہو گیا تھا۔ تاریخ میں مسلمانوں کی خدمات اور فکرِ انسانی کی ترقی، انسانی تہذیب و تمدن، انسانی معاشرے، معاشیات، سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی میں اسلام کی خدمات کو یا تو نظر انداز کیا گیا یا ان سے صرفِ نظر کیا گیا یا انہیں بہت گھٹا کر پیش کیا گیا۔ ہاں، ایک محدود سطح پر کچھ آوازیں ایسی ہیں جو اس صورتِ حال پر نظر ثانی کی کوشش کر رہی ہیں جو لازماً ایک بہت صحت مند پیش رفت ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مخالفانہ اسلوب ہی چھایا ہوا نظر آتا ہے اور اس بارے میں ہمارا اپنا تجربہ بھی کافی تلخ ہے۔ تقریباً تین سو سال تک، ہم مختلف شکلوں میں مغربی طاقتوں کے محکوم رہے ہیں۔ انہوں نے اسلام کو بدنام کرنے کی، اسلامی طاقتوں کو غیر مؤثر کرنے، انہیں دشمنوں کے ساتھ نشانے پر رکھنے اور عقلی، سیاسی اور معاشی اعتبار سے ایک نئی قیادت پیدا کرنے کی کوشش کی جو ان کے مخصوص مفادات کی نمائندگی کر سکیں۔ ایسی کوششیں مسلم معاشرے کے اندر بھی اور دوسری قومیتوں میں بھی جو دنیا کے اس حصے میں آباد تھیں، کی گئیں۔ چنانچہ یہ تجربہ جو تین سو سال پر محیط ہے، ایک زندہ حقیقت ہے اور اگرچہ گذشتہ ساٹھ، پینسٹھ برس میں سیاسی سطح پر کافی تبدیلیاں واقع ہو چکی ہیں اور معاشی طاقت کا توازن بھی بدل چکا ہے تاہم یہ حقیقت اب بھی اسی طرح ہے کہ یہ مغرب اور مخصوص مفادات ہی ہیں جن کا ہاتھ کسی نہ کسی طور پر اوپر ہے اور یہی وجہ ہے کہ جدید نوآبادیاتی نظام براہِ راست قبضے یا کنٹرول سے عبارت نہیں ہے بلکہ اس کی خاصیت ہے بالواسطہ قبضہ، جیسا کہ تاریخ دان اسے کہتے ہیں۔ مزید برآں استحصال، انتظامی اعتبار سے اثر اندازی، یہ ہے اس کا نیا انداز۔ چنانچہ اس تناظر کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

اس کے ساتھ ساتھ، تحریکِ آزادی کے دوران اور پھر آزادی کے بعد، مسلم معاشرے کے اندر کچھ ایسے خاص رجحانات رہے ہیں جنہیں مستقبل میں اسلام اور مغرب کے مابین تعلقات کو گہرائی سے سمجھنے کے لیے نگاہ میں رکھنا ضروری ہے۔ اول تو وہاں مزاحمت تھی، پھر اس مزاحمت نے تین رخ اختیار کر لیے۔ ان میں سے ایک تو یہ تھا کہ انہیں احساس ہو گیا کہ اب طاقت ان کے ہاتھ میں نہیں رہی اور انہوں نے طاقت کو دوبارہ حاصل کرنے کے بجائے، سب سے زیادہ اہمیت اس بات کو دی کہ اپنی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

روایات کا تحفظ اور بچاؤ یقینی بنایا جائے۔اس طرح سے روایت پسندی اور قدامت پرستی ایک اہم طاقت بن گئے۔لیکن اس طریقہء کار سے اسلام کا پھیلاؤ اور اس کی آفاقیت-ایک خاص حد تک محدود ہوکر رہ گئے۔ چنانچہ (نوآبادیاتی نظام کے خلاف) یہ ایک روایتی ردعمل تھا۔ایک دوسرا ردعمل قبولیت اور ہم آہنگی پر مبنی تھا جو اسلام کے خلاف براہِ راست بغاوت کا نہیں تھا۔وہ ایک قسم کا سمجھوتہ چاہتے تھے جسے آزاد خیالی اور جدیدیت کا نام دیا جاتا ہے۔حکمران طاقت نے تو اسے خوش آمدید کہا اور اس کی حوصلہ افزائی اور حمایت کی کیوں کہ اسے کسی نہ کسی صورت میں اِس رجحان کو مضبوط کرنا ہی تھا۔انہی لوگوں میں بعض ایسے تھے جن کا رویہ معذرت خواہانہ تھا اور انہوں نے مغربی اقدار کو اپنانے اور انہیں اسلامی تہذیب کا حصہ بنانے کی بھی کوشش کی۔ان کا استدلال تھا کہ جو کچھ مغرب کر رہا ہے، وہ اسلام کی روح کے منافی نہیں ہے وہ ہمیں قبول ہے اور ہم اس کو من وعن تسلیم کرتے ہیں۔

ردعمل کی ان دو اقسام کے اتصال اور اختلاف کے مابین ایک تیسری طاقت ابھری جسے تحریکِ احیاء کا نام دیا جاتا ہے۔قوسِ قزح کی طرح اس کے بھی بہت سے رنگ تھے اور یہ محض یک رنگی نہیں تھی۔ان کا بنیادی خیال یہ تھا کہ ہمیں اپنی شناخت اور آزادی کا تحفظ کرنا ہے، مزید یہ کہ اسے کیسے حاصل کیا جائے، ہمیں مسائل کا مقابلہ کرنا اور چیلنجز کا جواب دینا ہے اور یہ جواب اپنی اقدار و روایات کے ساتھ وفادار رہتے ہوئے ہونا چاہیے، اس کے ساتھ ساتھ دوسروں سے جو کچھ ہم سیکھ سکتے ہیں اس کے لیے ذہن کھلا رکھا جائے نیز یہ کہ وہ کون سے امور ہیں جہاں اشتراک ممکن ہے اور کہاں کہاں اختلاف لازمی ہے۔

میرا خیال ہے کہ یہ تین بڑی تحریکیں تھیں جن میں اتار چڑھاؤ آتا رہا اور ہم اب بھی انہی رجحانات کے دور سے گزر رہے ہیں۔کبھی جدیدیت پسند غالب آجاتے ہیں، کبھی روایت پسند اور کبھی تحریکِ احیائے دین کے حامی زیادہ مؤثر ہوجاتے ہیں۔ہم اب بھی اس اندرونی کشمکش کا شکار ہیں اور اس سے دو تناظر سامنے آتے ہیں۔

میری رائے میں، جب ہم حال اور مستقبل پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ایک نظریاتی پہلو یقیناً

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

موجود ہوتا ہے۔ یعنی دنیا کے بارے میں نقطہ نظر، انسان اور معاشرے کے متعلق بصیرت، اصول و اقدار، معاشرے اور ریاست کی قسم اور مطلوبہ دنیا کا تصور۔ یہی موضوعات ہیں جہاں سنجیدہ قسم کے اختلافات ہیں اور اس کے متعلق میرا خیال ہے کہ یہی وہ مقام ہے جہاں پوری تاریخ انسانی دو قوموں میں بٹی نظر آتی ہے یہ دو قومی نظریہ محض تحریکِ پاکستان کی جدوجہد تک ہی محدود نہیں ہے۔ ایک گروہ کا عقیدہ وایمان جن عناصر سے تشکیل پاتا ہے، اس میں کائنات کی روحانی تعبیر، خالق و مالک کی حقیقت، اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے بارے میں تصور، خدائی منصوبہ اور اس میں انسان کا مقام اور اس کی ذمہ داری اور انسانوں کا مقصد اور ان کا کردار وغیرہ اُمور شامل ہیں۔ مگر مذہبی روایات میں بھی اختلاف ہے وہ تضاد اور اختلاف کا شکار ہیں۔ تاہم یہ گروہ، میرے خیال میں، سب سے زیادہ واضح، قابلِ فہم اور مضبوط فکری بنیادیں رکھتا ہے۔ دوسرے مذاہب اور کچھ دوسرے لوگ بھی ہیں جو معاشرے کے مسائل کو عقیدے یا ایمان کے زاویے سے دیکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

دوسرا گروہ وہ ہے جس کے ہاں دنیا کے بارے میں ایک مختلف نقطہ نظر یا ''روشن خیال'' تصور پایا جاتا ہے۔ وہاں انسان خود مختار ہے، وہاں آپ کو اپنے خالق (اللہ) سے اپنا تعلق جاننے کی ضرورت نہیں۔ انسانی معاشرہ ہی مطالعے کا اصل میدان ہے۔ لہٰذا لادینیت اور آزاد خیالی وہ خصوصیات ہیں جن سے مغربی تہذیب ابتداً متصف ہے۔ اگرچہ میں اس بات سے انکار نہیں کرتا کہ اس کے باوجود مذہبی روایات کا ایک اہم کردار ہے اور ایسی طاقتیں بھی موجود ہیں جو ان میں، بعض اوقات مفاہمت اور بعض اوقات انضمام کی کوشش کر رہی ہیں۔ تاہم وہاں یہ دو متضاد رجحانات موجود ہیں۔ دوسرا پہلو سیاسی، عسکری اور معاشی ہے اور میرے خیال میں تیسرا پہلو ثقافتی، تہذیبی اور انسانی ہے۔ اور ان تینوں اعتبار سے تعاون یا مخاصمت کا پہلو یقیناً موجود ہے اور ہمیں اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔

یہاں بطور ایک جملہ معترضہ، میں ضمناً اس بات کی طرف اشارہ کرنا چاہوں گا کہ ایک درجہ تو وہ ہے جس پر میں تجزیہ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں لیکن ایک دوسرا درجہ بھی ہے جو بنیادی طور پر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خطرے کے گمان و خدشات سے اور ان خدشات کی بنیاد پر ردِعمل سے تشکیل پاتا ہے۔ میں اس بات سے انکار نہیں کرتا کہ یہ صورتِ حال دونوں طرف موجود ہے۔ جس طریقے سے اسلام، مسلم دنیا اور مسلمانوں کو خوفناک بنا کر پیش کیا گیا ہے، ان کو نشانہ بنایا گیا ہے اور مغربی طاقتوں کی حکمتِ عملی کے حصے کے طور پر ان کے ساتھ امتیازی سلوک کیا گیا ہے، اور جب میں لفظ طاقت کا استعمال کرتا ہوں تو میری مراد محض سیاسی طاقت نہیں ہوتی بلکہ طاقت، اپنے وسیع معنی میں مراد ہوتی ہے یعنی عقلی، سیاسی، معاشی، سماجی۔ چنانچہ مسلمانوں کی خوفناک تصویر کشی بھی ایک زمینی حقیقت ہے، خواہ ہم اسے پسند کریں یا نہ کریں، کم از کم میں تو اسے پسند نہیں کرتا، لیکن ہم اسے نظر انداز نہیں کر سکتے اور نہ ہی ہم اس سے فرار اختیار کر سکتے ہیں۔ مجموعی سیاسی فضا، حتیٰ کہ دفاعی پالیسیاں بھی حقائق اور واقعات کے معروضی تجزیے کی بنیاد پر نہیں بلکہ تصوراتی، گمان پر مبنی اور خطرے کے ان تصورات کو سامنے رکھ کر بنائی جاتی ہیں جو کہ ہمیں پیش آمدہ کئی مسائل کی تہہ میں موجود ہیں۔ لہٰذا، ضمناً میں نے اس کا ذکر کیا ہے تاکہ یہ پہلو مکمل طور پر نظر انداز نہ ہو جائے۔

اِس مرحلہ میں ایک سوال مزید اٹھانا چاہتا ہوں وہ یہ کہ ہمارے اور ان کے درمیان تعلقات، رابطہ، مقابلہ، تعاون اور مخاصمت – یہ سب کچھ ہونا چاہیے۔ ان سب پہلوؤں کے تناظر میں، جن کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے، زمینی حقائق کا پوری ایمانداری سے جائزہ لیتے ہیں تو طاقت کا عدم توازن سب سے بڑا مسئلہ نظر آتا ہے۔ اگرچہ مسلمان خودمختار ہو چکے ہیں، ان کے پاس معاشی وسائل ہیں، وہ اپنے لیے کوئی مقام بنانا چاہتے ہیں، مگر نوآبادیاتی طاقتوں کی تمام تر شکستوں اور پسپائی کے باوجود، طاقت کا عدم توازن موجود ہے۔ یہ عدم توازن ٹیکنالوجی، عسکری، معاشی، سیاسی، عقلی اور سائنسی میدان میں بہت زیادہ ہے۔ اس تناظر میں، اسلام کو ایک خطرے کے طور پر پیش کرنا ایک ایسی بات ہے جو مناسب محسوس نہیں ہوتی۔ سوائے ضمناً اس بات کی طرف اشارے کے جس کی طرف سیموئیل ہنٹنگٹن نے بھی بہت دِقّتِ نظر سے اشارہ کیا ہے۔ یعنی جب طاقت میں عدم توازن ہوتا ہے تو لوگوں کے لیے اپنے جائز مقاصد کا حصول بھی ممکن نہیں رہتا اور وہ اس مقصد کے لیے مختصر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

راستوں (shortcuts) کی طرف مائل ہوتے ہیں، تشدد اور دہشت گردی بھی ایسا ہی راستہ ہے۔ چنانچہ اس طرح ترکی بہ ترکی جواب دینا اور نقصان کرنا ایک معمول کی بات بن جاتا ہے، یہ حقیقت ہے اور یہ حقیقت موجود ہے۔

تاہم، اگر ہم مجموعی ماحول پر نظر ڈالیں تو طاقت کا بہت زیادہ عدم توازن محسوس ہوگا اور جس طرح سے میں اسے دیکھتا ہوں، اور دیگر مسلمانوں کو بھی اس بات کی دعوت دیتا ہوں، وہ یہ ہے کہ طاقت یا اختیارات ایک ناگزیر پہلو ہے لیکن طاقت محض تباہ کن نہیں ہوتی اور طاقت کو صرف اور صرف ہم اپنی ذمہ داری پر ہی نظر انداز کر سکتے ہیں۔ لہٰذا جب ہم اسلام اور مغرب پر بحث کر رہے ہوتے ہیں تو ہمیں اس حقیقت کا اچھی طرح ادراک ہونا چاہیے کہ جب تک ہم اپنے گھر کی اصلاح نہ کر لیں، جب تک ہم ذہنی، معاشی، سیاسی اور عسکری قوت نہ رکھتے ہوں تو ایک بڑی حد تک گمان ہے کہ مقابلہ ہمارے لیے نقصان دہ ہی ثابت ہوگا۔ تیاری کے بغیر لڑائی، تحرک کے بغیر سامنا اور ضروری تیاریوں کے بغیر طاقت کے اس کھیل میں حصہ لینے کے لیے ہمیں بہت زیادہ محتاط ہونا پڑے گا۔ چنانچہ جب ہم مغرب کے ساتھ تعلقات کے معاملے پر بات کر رہے ہیں تو مسلمانوں کے مابین اور امت کے مابین اس پہلو کو بھی ذہن میں رکھنا چاہیے۔ ہمارے لین دین، ہمارے متاثر کن ہونے، اپنے مفادات کا تحفظ کرنے کی ہماری صلاحیت اور ہم جو کچھ انسانیت کے لیے بہترین سمجھتے ہیں اسے پیش کرنے کی صلاحیت کو ہم طاقت کی بنیاد سے علاحدہ نہیں کر سکتے۔ لہٰذا میں اس بات پر زور دینا چاہتا ہوں کہ ہماری سوچ، ہماری منصوبہ بندی اور ہمارے اعمال ہمیں اندھیرے میں نہ رکھیں ان کی انتہائی مربوط منصوبہ بندی ہونی چاہیے۔ خطرے یا نقصان کا اندیشہ تو ہمیشہ موجود ہی رہتا ہے لیکن خطرے اور جوئے میں یہ فرق ہوتا ہے کہ خطرہ نپا تلا، قابلِ اندازہ اور برداشت کیے جانے کے قابل ہوتا ہے۔ لہٰذا ہمیں اس پہلو پر بھی نگاہ رکھنی چاہیے۔ میرے خیال میں تعلقات کی تین تہیں یا جہتیں ہیں جن پر تمام تعلقات کو استوار کرنا ہوتا ہے۔ ایک تو، جیسا کہ میں نے پہلے کہا، نظریاتی ہے یعنی سماجی اور تہذیبی تہہ۔ دوسری معاشی، سیاسی یا زیادہ واضح الفاظ میں براہِ راست طاقت سے متعلق ہے جس میں اختلاف اور انضمام

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دونوں متوقع ہیں، نفع ونقصان کا بھی اندازہ لگانا ہوگا لیکن یہ بہت اہم میدان ہے۔ تیسرا پہلو کچھ مخصوص نوعیت کی اشتعال انگیز چیزوں سے متعلق ہے یا یوں کہیے کہ خاص مواقع یا ضروریات سے۔ ہمیں ان تینوں جہتوں کو خلط ملط نہیں کرنا چاہیے اگر چہ یہ سب آپس میں مربوط ہیں۔ لہٰذا اپنی سوچ کو واضح اور صاف رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ جب ہم اپنے مقاصد کا تعین کرنے، اہداف مقرر کرنے، اپنی ترجیحات سامنے لانے، اپنی حکمتِ عملی ترتیب دینے، منصوبہ عمل پر عمل درآمد کرنے، تدابیر، آلات یا اقدامات طے کرنے چلیں تو ان تینوں پہلوؤں سے واضح ترین مقاصد اور حکمتِ عملی ہماری منصوبہ بندی کا حصہ ہونے چاہییں۔ بصورت دیگر غلط اندازے ہمیں ہمارے تصوراتی خاکوں اور عملی اقدامات دونوں میں خاصی مہلک غلطیوں کی طرف لے جائیں گے۔

اشتعال انگیز چیزوں میں سے، جس سے میں آغاز کر رہا ہوں، میرے خیال میں نوآبادیاتی نظام کی مخالفانہ تحریک کا نامکمل حصہ وہ چیز ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ میرے خیال میں فلسطین کا مسئلہ اہم ترین ہے اور تجزیاتی اعتبار سے یہ نوآبادیاتی نظام کے نمونے سے مختلف نہیں ہے۔ یہ مقبوضہ لوگ ہیں۔ جب تک قبضہ ختم نہیں ہو جاتا، امن ممکن نہیں ہوگا۔ اس بات میں کتنا عرصہ لگے گا اس کے بارے میں کوئی پیشین گوئی نہیں کر سکتا۔ تاریخ یہ سبق دیتی ہے کہ جب تک ان زمینی تعلقات کو درست سمت میں استوار نہیں کیا جاتا، تناؤ، کشمکش اور مخاصمت سے نہیں بچا جا سکتا۔ کشمیر، چیچنیا، منڈاناؤ (فلپائن)، پتانی (تھائی لینڈ) مظلوم افراد کی طویل فہرست کے صرف چند عنوانات ہیں۔ میں صرف اس بات کی وضاحت کر رہا ہوں کہ نوآبادیاتی نظام کی مخالف تحریکوں کی یہ باقیات واقعتاً موجود ہیں اور جب تک ان کو حل کرنے کے لیے موضوعِ بحث نہیں بنایا جاتا ہم علاحدگی، کشمکش اور ان تعلقات میں سرایت کر جانے والی دشمنی سے چھٹکارا نہیں پا سکتے۔

دوسرے نمبر پر میں سیاسی و معاشی اور دفاعی پہلو کی جانب آتا ہوں۔ یہ حقیقت ہے کہ آزادی کے باوجود ہم آزاد نہیں ہیں۔ اگر آزادی کا مطلب ہے کہ آپ کو اپنے معاملات کو چلانے اور ان کا انتظام و انصرام کرنے کے مواقع اور صلاحیت حاصل ہو، آپ کو اپنے اقدار و مقاصد کو پورا کرنے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی آزادی ہو۔ تو یقیناً ہم آزاد نہیں ہیں۔ چنانچہ عالمی نظام کی بنیاد ناانصافی، طاقت کے ناجائز استعمال، استحصال، عدم مساوات اور مسلم دنیا اور اس کے ساتھ ساتھ دوسروں کے معاشی وسائل پر قبضے اور اپنے مقاصد کے لیے ان کے غلط استعمال پر ہے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے وہ سیاسی اتحادوں، اپنے ایجنٹوں کے استعمال اور بالواسطہ یا بلاواسطہ مداخلت جیسے کاموں کا سہارا لیتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ دہشت گردی کے متعلق سحر انگیز گفتگو کے دوران ان نازک اسٹریٹیجک امور پر بحث نہیں کی جاسکتی۔ اس کے لیے بامعنی بات چیت، تعلقات اور پرامن حل کی ضرورت ہے۔ لیکن اگر پرامن حل کا راستہ روکا جاتا ہے یا سبوتاژ کیا جاتا ہے تو آپ اس بات کی امید نہیں رکھ سکتے کہ اپنے حقوق کے لیے جدوجہد اور کشمکش نہیں ہوگی۔

اسی بات سے میں تیسرے اور اصل، عقلی اور سماجی، پہلو کی طرف آتا ہوں اور اس سے مراد بالادستی کا جامع تصور ہے یعنی دوسروں کو قابو کرنے اور ان پر حکم چلانے کا طاقتور کا حق۔ عقلی اعتبار سے اپنے اوپر یہ مسلط کر لینا کہ ہماری ہی اقدار کا رواج ہو، ہمارے مفادات برتر ہیں، خواہ زبانی جمع خرچ ہی سہی ہم انسانی حقوق، مساوات اور انصاف کے علمبردار ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس آخری تجزیے میں ہمارے سامنے دو نمونے (Paradigm) آسکتے ہیں۔ ایک نمونہ تو وہ ہے جہاں طاقت کا نمایاں راج ہو اور اسے دوسروں پر حکم چلانے کا اختیار ہو۔ خواہ یہ خطرہ مول لینے کی پالیسی ہو، معاشی استحصال، مداخلت، جنگ یا یہ کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ دوسرا نمونہ ایک ایسے وسیع الظرف معاشرے کا ہے، جہاں تعلقات کی بنیاد بالادستی اور زبردستی نہ ہو۔ جہاں اختیارات اور وسائل میں تفاوت کے باوجود، لوگوں کو یہ حق حاصل ہو کہ وہ اپنی اقدار، اپنے مقصدِ زندگی اور اپنے نصب العین کے مطابق زندگی گزار سکیں۔ جہاں برداشت کا رویہ عام ہو اور اپنے خیالات کو زبردستی تھوپنے کی کوششیں نہ کی جائیں اور جہاں محض معاشی اور سیاسی امداد کے لیے اپنی اقدار کا سودا اور ان سے دست برداری نہ ہو۔

اب میرے خیال میں اسلام اور مغربی تہذیب میں بنیادی فرق یہیں واقع ہوتا ہے، اگرچہ مغربی طاقتوں کے جو بھی دعوے اور اعلانات ہوں۔ خواہ یہ صاف صاف نوآبادیاتی نظام کا زمانہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہو یا نئے نوآبادیاتی نظام کا دور ہو یا بالادستی کا۔ اصل مسئلہ اس سوچ کا ہے کہ 'صرف ہم اور باقی کوئی نہیں'۔ 'اگر انہیں زندگی بسر کرنا ہے تو انہیں لازماً سرخم کرنا ہوگا'۔ یہاں مجھے سیموئیل ہنٹنگٹن کی دلچسپ کتاب 'تہذیبوں کا تصادم' کے ایک اہم اقتباس کا حوالہ دینے دیجیے، اگرچہ میں اس کے مقالے سے اتفاق نہیں کرتا لیکن میرا خیال ہے کہ اس کا مشاہدہ خاصے کی چیز ہے۔ اس کا کہنا ہے:

> ''مغرب کا اصل مسئلہ اسلامی بنیاد پرستی نہیں ہے۔ اصل مسئلہ اسلام ہے، جو کہ ایک مختلف تہذیب ہے۔ جہاں لوگ اپنی تہذیب کے برتر ہونے پر یقین رکھتے ہیں اور اپنے ماضی کے کمتر ہونے کا تصور ان پر طاری رہتا ہے۔ اسلام کا مسئلہ سی آئی اے (CIA) یا امریکی محکمہ دفاع نہیں ہے ان کا اصل مسئلہ مغرب ہے جو کہ ایک مختلف تہذیب ہے جس کے لوگ اپنی تہذیب کی عالمگیریت کے قائل ہیں اور یقین رکھتے ہیں کہ ان کی برتر، اگرچہ زوال پذیر طاقت، ان پر یہ فرض عائد کرتی ہے کہ وہ اپنی تہذیب کو ساری دنیا میں پھیلائیں۔ یہ وہ بنیادی عناصر ہیں جو اسلام اور مغرب کے مابین کشمکش میں اضافہ کرتے ہیں۔''

میں اس مسئلے کو اس قدر صاف گوئی کے ساتھ پیش کرنے پر ہنٹنگٹن کا شکر گزار ہوں۔

یہاں میں اس بات کا اعتراف بھی کرنا چاہتا ہوں میں یہ نہیں کہتا کہ ہمارے ایمان کی کمزوریاں نہیں ہیں۔ لیکن قرآن وسنت میں بیان کردہ تصور کے تحت اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اس دنیا کو اور تمام انسانوں کو تخلیق کیا اور اسی نے انسانوں کو اختیار اور آزادی دی ہے۔ یعنی ماڈل یہ نہیں ہے کہ تمام انسان جبراً کسی خاص راستے پر چلنے کے پابند کر دیے جائیں، خواہ یہ طریقہ اور راستہ اسلام ہی کیوں نہ ہو۔ قرآن میں کئی مقامات پر صاف الفاظ میں کہا گیا ہے کہ اگر ہم چاہتے کہ تمام انسان اسلام کی پیروی کریں تو ایسا ہوسکتا تھا لیکن ہم نے ایسا نہیں کیا۔ ہم نے انہیں آزادی عطا کی ہے۔ (مثلاً دیکھیے قرآن کی آیات ۵:۴۸، ۱۰:۹۹)

اس اختیار اور آزادی کا خیال رکھا جانا چاہیے۔ یہ آزادی غلط اور صحیح دونوں طرح سے استعمال کی جاسکتی ہے لیکن آزادیٔ اختیار کا حق اور غلطی کرنے کا امکان وجودِ انسانی کا حصہ ہے اور یہی دراصل انسان کے بطور خلیفۃ الارض ہونے کے کردار کا اہم ترین جزو ہے (القرآن ۲:۳۰)۔ ہاں،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آپ اپنے اختیار کو استعمال کرنے کے نتائج سے بھاگ نہیں سکتے۔ یہ نتائج اس دنیا میں اور بالآخر آخرت میں ظاہر ہوں گے۔ تاہم جہاں تک اس دنیا کی زندگی کا تعلق ہے تو اختیار ہمیں حاصل ہے، خواہ اس کا استعمال درست طور پر ہو یا غلط طور پر۔ اور اسی اختیار اور آزادی سے زندگی میں تنوع پیدا ہو جاتا ہے۔ قرآن کے الفاظ میں:

> ''دین میں کوئی جبر نہیں۔ صحیح بات غلط خیالات سے الگ چھانٹ کر رکھ دی گئی ہے۔ اب جو کوئی طاغوت کا انکار کر کے اللہ پر ایمان لے آیا، اس نے ایک ایسا مضبوط سہارا تھام لیا، جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں اور اللہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے۔'' (۲:۲۵۶)

یہی بنیادی راستہ ہے۔ چنانچہ یہ نمونہ تکثیریت کا حامل اور تنوع پسند ہے۔ یہ بات نہیں کہ ہمیں اپنے عقیدے کی حقانیت میں کوئی شک ہے۔ بلکہ ہم اس بات پر بھی ایمان رکھتے ہیں کہ انفرادی، اجتماعی، عالمگیر سطح پر حتیٰ کہ طاقت کی سطح پر بھی مثالی نمونہ تنوع کا حامل ہونا چاہیے جہاں مسائل اور معاملات کو بات چیت اور میل جول کے ذریعے حل کرنے کی گنجائش موجود ہو۔ جو بات اہمیت کی حامل ہے وہ گفت و شنید کی آزادی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کہتا ہے:

> ''اے نبیؐ، اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت دو حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ اور لوگوں سے مباحثہ کرو ایسے طریقہ پر جو بہترین ہو۔ تمہارا رب ہی زیادہ بہتر جانتا ہے کہ کون اس کی راہ سے بھٹکا ہوا ہے اور کون راہِ راست پر ہے۔'' (۱۶:۱۲۵)

چنانچہ یہ مکالمہ، گفت و شنید اور میل جول ہی ہے جو تمام سطحوں پر ہونا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں طاقت کی کشمکش انسانی کھیل کا حصہ ہے وہیں خیالات کا تبادلہ اور دعوت دینا اصل وسیلہ ہے۔ میل جول، اختلافات انسانی معاشرے کا اصل حسن ہے۔ ہمیں یک رُخے، جابرانہ تسلّط سے جان چھڑانا ہوگی۔ اس ستم ظریفی پر تو نظر ڈالیے کہ ایک طرف ہم کہتے ہیں کہ 'تمام انسان برابر ہیں' دوسری جانب ہم یہ کہتے ہیں کہ ایک امریکی شہری، ایک امریکی فوجی اگر قتل، قتلِ عام یا جنگی جرائم کا بھی مرتکب ہوتا ہے تو اس پر اس ملک کے قوانین کے تحت مقدمہ نہیں چلایا جا سکتا جہاں اس نے جرم کیا ہو، وہ صرف امریکی قانون کا پابند ہے۔ یہ ہے وہ یک طرفہ سامراجی، تسلّط پسند ذہنیت۔ جب تک اس کو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

چیلنج نہیں کیا جاتا، عالمگیر امن اور خوشحالی کا مثالی نمونہ وجود میں آنا ممکن نہ ہوگا۔ اگر اسلام اور مغرب کے مابین یہ مکالمہ ایک ایسے تہذیبی مستقبل کی جانب پیش قدمی کرے جہاں غالب ہونے کی سوچ، ایک نظریے اور ایک طاقت کے غلبے کی سوچ کو تنوع، صحت مند مقابلے اور تعاون سے بدل دیا جائے تو یہ عین مناسب ہوگا۔ یقیناً انسانی حالات ایسے ہوتے ہیں جہاں کشمکش اور تضاد لازماً ہوتا ہے۔ یہ تو کھیل کا حصہ ہے، تاہم ایک سطح پر ایسا نمونہ ہونا چاہیے اور صرف یہی نمونہ حقیقی عالمگیر امن دے سکتا ہے۔

چنانچہ جنگ، تاریخِ انسانی کے ہر دور میں بین الاقوامی تعلقات کے انصرام اور معیشت میں ایک اہم آلہ ءکار رہی ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ یہ ذریعہ اب مکمل طور پر ختم ہو چکا ہے۔ محدود جنگیں ایک حقیقت ہے اور ہمیں اس حقیقت کے ساتھ زندہ رہنا ہے۔ ٹیکنالوجی کی جنگ بھی ایک حقیقت ہے اور ہمیں اس کے مطابق خود کو تیار کرنا ہوگا۔ مگر پھر بھی کیمیائی صلاحیت کی وجہ سے، طاقت اور دہشت کا عالمی توازن ایک ایسے مقام پر پہنچ چکا ہے جہاں جنگ صرف ایک مرتبہ ہی ممکن رہ گئی ہے۔ جس کا مطلب ہے کہ ٹیکنالوجی بھی ہم پر حکمرانی کر رہی ہے۔ اس نے نہ صرف دنیا کو کھول کر رکھ دیا ہے بلکہ تباہی کی بعض اقسام کے دروازے بھی بند کر دیے ہیں تاکہ ہم ایک ایسے عالمگیر نظام کی طرف بڑھ سکیں جس کی بنیاد عدل پر رکھی جا سکے۔ جہاں عدل اور احسان رہنما اصول ہوں جہاں بقائے باہمی اور تعاون کو کشمکش اور لڑائی جھگڑے پر فوقیت حاصل ہو اور اگر کہیں لڑائی جھگڑا ہو بھی تو اس کو حل کرنے کا طریقہ ءکار موجود ہو بصورت دیگر یہ طاقت کی تباہی ہے۔

یہ وہ تاریخی لمحہ ہے جہاں ہم موجود ہیں اور یہیں میں انتہائی انکساری کے ساتھ یہ بھی عرض کروں گا کہ اسلام انتہائی اہمیت اور قدر و قیمت کی حامل تعلیمات رکھتا ہے اور یہی انسانیت کی واحد امید ہے لیکن یہ امید اسی صورت میں برآ سکتی ہے اگر ہم اسلام کے بہتر نمائندے بن جائیں۔ اپنے گھر کی ترتیب درست کر لیں اور اس بات کا ادراک کر لیں کہ جہاں ذاتی نیکی، کردار، اخلاقی بلندی، تقویٰ اور اللہ کا خوف بنیادی چیزیں ہیں، وہیں ان تمام کا عکس سماجی، معاشی اور سیاسی معاملات میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بھی نظر آنا چاہیے۔ ہمیں جو سبق پڑھانے کی کوشش کی جارہی ہے وہ یہ ہے کہ اسلام کا یہ نیا چہرہ، یعنی وہ اسلام جو چند مقاصد۔جن میں عدل ایک بنیادی مقصد ہے اور عبادت ایک بنیادی مقصد ہے۔کو حاصل کرنے کے لیے انسانوں اور معاشرے کو بدل دینا چاہتا ہے وہ دراصل تشدد پسند، سیاسی اور جنگجو قسم کا اسلام ہے اور حقیقی اسلام صوفیانہ اور دھیمے مزاج کا اسلام ہے۔ یہ بات خطرناک حد تک غلط اور گمراہ کن ہے۔لہٰذا میں یہ بات کرنا چاہتا ہوں کہ اب جب کہ ہمارے پاس یہ عظیم ترین موقع ہے، اس موقع کو محض نعروں کی بھینٹ نہیں چڑھا دینا چاہیے بلکہ واضح سوچ، وقت کے تقاضوں کے مطابق چیلنجز کا جواب دے کر، وسائل اور ذرائع کو استعمال کر کے اور جہاں فائدہ ہوسکتا ہو، وہاں ٹیکنالوجی کا استعمال کر کے اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔

یونیسکو کی عرب دنیا کے حوالے سے مرتب کردہ رپورٹیں، جس میں سے اب تک تقریباً دس سامنے آچکی ہیں انتہائی قابلِ افسوس حالت سامنے لاتی ہیں۔ اس سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ کتابوں کی تعداد، جامعات، ایجادات، تخلیقات کے حوالے سے ہم کہاں کھڑے ہیں۔ میں یہ تجویز کروں گا کہ جہاں ہمیں اس بات کا بھی واضح پتہ ہونا چاہیے کہ ہم کیا حاصل کرنا چاہتے ہیں، جہاں بعض مقامات پر متفق ہونے اور بعض پر اختلاف کی گنجائش ہے وہیں ہمیں اپنے مقام کا بھی پتہ ہونا چاہیے اور ہمیں اس کا احساس کروانا چاہیے۔ ہمیں اس بات کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے کہ جب تک مسلم دنیا خود اپنے گھر کو درست نہیں کر لیتی، جب تک ہم خود اچھی مثال پیش نہیں کرتے، ہم اپنے دین اور انسانیت کی خدمت نہیں کر سکتے۔ کیونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا ہے کہ یہ امت 'امتِ وسط' ہے اور انسانیت کے سامنے حق کی گواہی دینے کے فرض پر مامور کی گئی ہے اسی طرح جیسا کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے سامنے حق کی گواہی دی۔ لہٰذا یہ وہ لائحہ عمل ہے جو ہمارا مقصد ہے اور ہم اس کو کہاں تک حاصل کر سکتے ہیں، یہ ہم پر منحصر ہے۔ ہمارا تصور تخریب کا نہیں بلکہ تعمیر کا ہے اور اس راہ میں جو بھی تباہی ہوتی ہے یا تغیر آتا ہے تو یہ تبدیلی ہی کا حصہ ہے۔ لیکن ہماری سوچ کبھی بھی منفی نہیں ہونی چاہیے۔ ہمارا مقصد تعمیری ہو اور یہی وہ طرزِ عمل ہے جسے ہمیں اپنانا ہوگا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں اس بات پر اپنی گفتگو کا اختتام کرنا چاہوں گا کہ جبکہ اسلام اور مغرب لمحہءموجود میں ایک دوسرے سے ٹکراتے نظر آتے ہیں اور ''تہذیبوں کے تصادم'' کے نظریے کو مختلف سطحوں یعنی عقلی، سیاسی، معاشی اور عسکری سطح پر ہوا دی جا رہی ہے۔ لیکن انسانیت اور مسلم امہ کی بھلائی کے لیے ضروری ہے کہ 'ایسے کو تیسا' اور جذباتی ردعمل کے بجائے، جس کے جواز پر بھی دلائل دیے جا سکتے ہیں، ہمیں اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اپنے آپ کو تیار کرنا ہوگا تا کہ انسانیت کی مجموعی فلاح کے لیے ہم اپنے خواب کو حقیقت میں بدل سکیں۔ اس میں تدریج ہونی چاہیے لیکن ہر قدم آگے بڑھنے والا ہونا چاہیے۔ اگر ہم محض وقت گزاری کر رہے ہیں اور حقائق اور چیلنجز سے چشم پوشی کر رہے ہیں تو اللہ کی سنت یہ ہے کہ جو اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کو پورا نہیں کرتا، دوسرے اُس کو کچل ڈالتے ہیں۔ ہمیں یہ توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ تاریخ ہمارے لیے نئے قانون بنائے گی، ہمیں چیلنجز کا سامنا کرنا ہوگا اور تخلیقی صلاحیت کے ذریعے اس کا جواب دینا ہوگا۔ یہی واحد راستہ ہے اور یہی میری دعا ہے۔

مکالمہ

تبصرہ وسوال (ڈاکٹر سفیر اعوان): پروفیسر صاحب نے بہت بصیرت آمیز اور جامع گفتگو کی ہے، کہ اب بظاہر سوالات کے لیے کچھ بچا نہیں۔ ان کی گفتگو بہت منظم تھی، جو چند پرانے خیالات پر مبنی تھی، لیکن اس کے ساتھ ساتھ چند برجستہ نئے سوالات بھی اٹھائے گئے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ پہلی بار، میں نے اس پلیٹ فارم سے ایسی بصیرت آمیز اور ترقی پسندانہ گفتگو سنی ہے۔ متعدد سوالات اٹھائے جا سکتے تھے؛ پہلا ان دو اصطلاحات کے بارے میں ہے جو گزشتہ پچاس سالوں سے ہمارے ساتھ ساتھ ہیں، نو آبادیاتی عہد کے خاتمے اور دوسری جنگ عظیم کے زمانے سے؛ وہ ہیں اسلاموفوبیا اور اسلاموٹوپیا۔ اسلاموٹوپیا یا مثالی اسلامی ریاست کو جمال الدین افغانی اور محمد اقبال نے بتصریح بیان کیا اور بعد میں یہ موضوع سید مودودی کو منتقل ہو گیا۔ نائن الیون کے بعد مغربی معاشروں میں اسلاموفوبیا بڑھ رہا ہے۔ میرا سوال ان دونوں اصطلاحات کے حوالے سے ہے، جو 'تصادم کے نظریے'

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں بہت عام ہیں، جسے پہلے برنارڈ لوئس نے پیش کیا اور پھر ہنٹنگٹن نے۔

میرا خیال ہے کہ سید مودودی اور سید قطب کی تحریروں میں پیش کیے گئے دفاعی جہاد اور جمہوریت کے ذریعے مثالی اسلامی ریاست کے نظریے کو تشدد شعار اسلام پسندوں نے ہائی جیک کر لیا ہے۔ان اصطلاحات کو استعمال کرتے ہوئے میں صرف مغربی بیان کو پیش یا اس کی تصدیق کر رہا ہوں جو وہاں کے ذرائع ابلاغ میں بہت زیادہ رائج اور عام ہے۔اس لیے ہم موجودہ عہد میں دیکھیں تو سید مودودی یا سید قطب کی جہاد یا مثالی اسلامی ریاست کے حوالے سے تحریریں مغرب کے عوامی تذکروں کا حصہ نہیں۔ بلکہ اس کے مقابلے میں ابوبکر ناجی کی "The Management of Savagery" یا ابومصعب السوری کی "Call to Global Islamic Resistance"، یا نائن الیون سے قبل اور بعد میں القاعدہ کے کئی بیانات سامنے ہیں۔اس لیے مجھے اس بات کی پریشانی ہے، اور اس پر میں پروفیسر صاحب کی رائے بھی جاننا چاہوں گا؛ کہ سید مودودی، سید قطب اور محمد قطب اور عرب دنیا میں دیگر افراد کی جانب سے واضح طور پر بیان کردہ انتہائی پرامن نقطہ نظر ہائی جیک کر لیا گیا اور اس کی جگہ ایک ایسے انتہائی پرتشدد نقطہ نظر نے لے لی ہے جو عام شہریوں تک کو مارنے سے چشم پوشی کرتا ہے، اور یہی نظریہ مغربی ذرائع ابلاغ اور ساتھ ساتھ وہاں کے عوامی نظریے کو گمراہ کر رہا ہے۔

یعنی سوال یہ ہے کہ ہم بحیثیت مسلمان کس طرح خود کو پرتشدد راستے سے علاحدہ کر سکتے ہیں؟

جواب: آپ نے بہت اہم مسئلہ اٹھایا ہے، اور میں حقائق کے تلخ ہونے کے باوجود ان سے نظریں چرانے پر یقین نہیں رکھتا۔آپ کا کہنا درست ہے کہ عذر خواہوں کے نقطہ نظر کے خلاف جو اسلام میں مغربی معیارات، اقدار اور انہی کے مطالبات کے تحت تبدیلیاں چاہتے ہیں؛ مجددین جمال الدین افغانی، محمد قطب، سید قطب، محمد عبدہ، اقبال، ابوالکلام آزاد اور پھر مولانا مودودی نے بھی بنیادی اقدار اور مقاصد پر سودے بازی کیے بغیر جواب دیا۔ان کا طریقہ یہ تھا کہ تبدیلی کی حکمت عملی اور مقاصد کو قرآن اور حضرت محمدؐ کی سنت سے اخذ کیا جائے اور ان طریقوں سے جو ان سے ماخوذ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہیں۔ جہاد یقیناً بنیادی تصورات میں سے ایک تھا۔ یہ بہت دلچسپ بات ہے کہ میری معلومات کی حد تک اسلام پر دانشورانہ سطح پر پہلا حملہ اسلامی دور کی پہلی صدی میں ہوا اور یہ ایک عیسائی مصنف اوگاتھ کی جانب سے تھا، اور اس دن کے بعد سے یہ داستان اب تک چلی آتی ہے۔

لہٰذا مودودی، اقبال اور سیّد قطب نے تصور جہاد پر کوئی سمجھوتا نہیں کیا اور نہ اس سے شرمائے۔ مگر انہوں نے چیزوں کو ایک خاص تناظر میں رکھنے کی کوشش کی اور امت کو یہ باور کرایا کہ تلوار کا بھی ایک مقام ہے؛ میں جب یہ کہتا ہوں کہ بین الاقوامی قانون میں یہ بات مسلّم ہے کہ جنگ خارجہ پالیسی کا ایک اہم جزو ہے، تو میں اپنی طرف سے کوئی تصور نہیں گھڑ رہا ہوں۔ مگر ''انصاف کے لیے جنگ'' اور ''جارحیت کے لیے جنگ'' دو مختلف چیزیں ہیں۔ تو ان لوگوں نے منصفانہ جنگ اور غیر منصفانہ جنگ میں فرق کیا ہے اور بتایا ہے کہ جنگ کی کیا شرائط ہیں، کیا ذمہ داریاں ہیں اور وہ کیا حدود ہیں جن کو جنگ کے دوران ملحوظ خاطر رکھا جانا ضروری ہے۔ اس لیے جنگی آپریشنوں اور جارحیت کے خلاف مزاحمت اس کا ایک حصہ ہے۔ مگر اس کے باوجود ردعمل کی بھی کچھ حدود ہیں اور اسے کسی اخلاقی پابندی اور شرط سے آزاد نہیں ہونا چاہیے۔ اب انحراف اور اخلاقی پستی تو ہمیشہ سے ہی رہی ہے؛ خوارج کے بعد سے یہ روایت چلی آ رہی ہے جسے ہم انتہاپسندی سے تعبیر کرتے ہیں، یہ انسانی تاریخ کا حصہ ہے۔

جہاں تک میں اس معاملے کو سمجھا ہوں، وہ تمام اسلامی تحریکیں جنہوں نے جہاد کے تصور اور اس کی اہمیت پر کوئی سمجھوتا نہیں کیا ان سب نے یہی کہا ہے کہ انسانی معاشرے میں تبدیلی ایمان اور یقین کے ذریعے برپا ہونی چاہیے۔ اقدار اور نظریات کو کسی کے حلق سے زبردستی اتار کران کو قبول نہیں کروایا جا سکتا، اور جب بھی ایسا ہوا ہے تو ایمان کے بجائے منافقت نے جنم لیا ہے۔ ایمان تو ''تصدیق بالقلب'' یعنی دل سے تسلیم کرنے کا نام ہے، اور یہ ایک اندرونی معاملہ ہے، اسے اوپر سے تھوپا نہیں جا سکتا۔ اس لیے دعوت، تیاری، تعلیم، معلومات، تحرک اور شرکت کے ذریعے تبدیلی آتی ہے اور اس عمل کے دوران ایک وقت ایسا آ سکتا ہے جب طاقت کا استعمال ناگزیر ہو جاتا ہے؛ ہم نے کبھی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس سے نظریں نہیں چرائی ہیں۔ مگر یہ جو متشدد ردعمل ہم آج دیکھتے ہیں یہ ان اقدار اور طریقوں سے مطابقت نہیں رکھتا۔ مگر اس کے باوجود ہمیں اس حقیقت کو سمجھنا ہوگا کہ اس انحراف اور غلط روی کی بھی کچھ وجوہات ہیں اور انہیں محض طاقت کے بل بوتے پر ختم نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ ان کو کنٹرول اور منضبط کیا جا سکتا ہے جس کے لیے بات چیت اور صبر سے کام لیا جانا ضروری ہے۔ اور ان دروازوں کو کھولنا ہوگا جن کے ذریعے تبدیلی آتی ہے۔

اگر آپ دریا کے راستے میں رکاوٹ کھڑی کریں گے تو وہ بہنے کے لیے دوسرے راستے ڈھونڈ لے گا جو کسی حد تک تباہ کن بھی ہو سکتے ہیں۔ وہ فصلوں اور انسانی آبادیوں کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔ لیکن اگر آپ اس پانی کو بہنے دیں اور اسے موقع دیں تو اس انحراف کو روکا اور کنٹرول کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے میرا خیال ہے کہ یہ ہے وہ پیچیدہ صورت حال جس سے ہمیں سابقہ درپیش ہے؛ اور میں آپ کو بتاتا چلوں کو متشدد ردعمل ہمارا طریقہ کار نہیں ہے اور ہم نے کبھی اس کی حمایت نہیں کی۔ مگر اس کے ساتھ ہی ہمیں یہ بھی کہنے دیجیے کہ اس صورتحال کا ایک خاص پس منظر اور عوامل ہیں جن کو حل کیا جانا ضروری ہے، اور موجودہ صورتحال میں ایسا نہیں کیا گیا۔ **اور اگر نائن الیون حملوں میں تین ہزار معصوم لوگوں کی جانیں گئیں تو ان میں سے ایک چوتھائی مسلمان بھی تھے جو دنیا کے کسی ایک ملک سے نہیں بلکہ ۶۰ مختلف ممالک سے تعلق رکھتے تھے۔ مگر اس کے جواب میں امریکہ نے جو حکمت عملی اختیار کی اس کے نتیجے میں دس لاکھ سے زائد لوگوں کا قتل عام ہوا، لاکھوں لوگ نقل مکانی کرنے پر مجبور ہوئے اور کئی مہذب ممالک کو تباہی کا سامنا کرنا پڑا۔ نتیجتاً دہشت گردی میں اضافہ ہوا۔ تو میں ان لوگوں میں سے** ہوں جو اس پرتشدد ردعمل سے مطمئن نہیں، لیکن ساتھ ہی اس بات کا بھی احساس رکھتا ہوں کہ صرف مذمت اس مسئلے کا حل نہیں۔

جیسا کہ آپ نے اسلاموفوبیا اور اسلاموٹوپیا کی طرف اشارہ کیا تو ان اصطلاحات کے ذریعے خاص مقاصد حاصل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اور اب تو اسلاموفوبیا سے بڑھ کر ایک جدید اصطلاح اسلاموفاشزم آ گئی ہے۔ کوئی اور نہیں فوکویاما ان لوگوں میں سے ایک ہے جنہوں نے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فارن پالیسی میگزین میں اپنی سنجیدہ تحریروں میں اسے استعمال کیا ہے ۔ میرے خیال میں یہ اصطلاحات بے معنی ہیں اور یہ ایک خاص ذہنیت پیدا کرنے کے لیے بنائی گئی ہیں ۔ ہمیں چاہیے کہ ان سے متاثر نہ ہوں اور توازن قائم رکھنے کی کوشش کریں ۔

سوال (ڈاکٹر سفیر اعوان): میرا اگلا اور آخری سوال اسلام اور مغرب کے تعلقات میں اس تازہ ترین موڑ کے حوالے سے ہے ۔ یہ عرب بہار کی اہمیت سے متعلق ہے ۔ اور یہاں میں حوالہ دینا چاہوں گا اور اس کا تعلق جوڑوں گا اس بات سے جو آپ امت مسلمہ کے حوالے سے کہہ چکے ہیں ۔ اور مجھے تعجب ہے کہ حمایت کے طور پر آپ نے ہنٹنگٹن کا حوالہ دیا ہے ۔ ایک امت کا تصور، جو ہم صرف جمال الدین افغانی ہی نہیں بلکہ عہد حاضر کی دیگر شخصیات کی بدولت بلا شبہ دوبارہ حاصل کر چکے ہیں، مگر خصوصاً برصغیر میں یہ تصور دوسرے مسلم معاشروں کی بدولت زیادہ مضبوط ہے؛ اور جہاں میرے مطالعے کے مطابق اسلام بنیادی عنصر نہیں ہے ۔ کیونکہ اسلام کا نچوڑ اس کے مذہبی اعتقاد میں ہے نہ کہ اس کے ثقافتی تنوع میں ۔ اور یہ بات کچھ اسلامی جماعتوں کی کامیابی سے ظاہر ہے، جیسے تیونس میں النہضہ، ترکی اور مراکش میں عدالت و ترقی پارٹی اور اگر میں کہوں مصر، اور شاید اب آنے والے دنوں میں لیبیا میں بھی، اخوان المسلمین ۔

جب ہم ان جماعتوں کی کامیابی کی طرف دیکھتے ہیں اور ان کے سیاسی اسلام کے تصور، یا اس بہتر اور اصلاح شدہ اسلام کو جس پر یہ ان مختلف ممالک میں عمل کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں، ہمیں نظر آتا ہے ان میں صرف ایک چیز یکساں ہے اور وہ ہے مذہبی اعتقاد ۔ بصورت دیگر وہ بہت سمجھدار اور عملی ہیں؛ اور وہ اس قومی ریاست، اقوام متحدہ، عالمگیر تجارت، سیاست اور ثقافت کے دور میں بین الاقوامی برادری کے ساتھ رہنے کو تیار ہیں ۔ اس لیے میرا خیال ہے کہ انہوں نے اپنی سوچ اور حکمت عملی کو تبدیل کر لیا ہے اور یہ ایک وجہ ہے کہ عوام ان کی طرف متوجہ ہوئے اور انہیں اقتدار کے ایوانوں تک لے کر آئے ہیں ۔ اگر ہم ان کا مقابلہ پاکستان جیسے ملک کی اسلامی جماعتوں سے کریں تو ہم دیکھتے ہیں کہ یہاں امت کا تصور تو ایک طویل عرصے سے موجود ہے مگر انتخابات میں ان کی کارکردگی ہمیشہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

غیر تسلی بخش رہی۔

اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ پاکستان جیسے ملک میں اسلامی جماعتوں کا کیا مستقبل ہے؟ اور آنے والے دنوں میں ہم عرب بہار کے دوران اسلامی جماعتوں کی جانب سے اٹھائے گئے فائدوں کو مزید کیسے دیکھ سکتے ہیں؟ اور کس طرح عرب بہار اسلام۔مغرب تعلقات کے حوالے سے ایک اہم موڑ ہے، کیونکہ چند دہائیوں یا اس سے کچھ پہلے جب ایف آئی ایس یا اسلامک سالویشن فرنٹ نے الجزائر میں انتخابات میں کامیابی حاصل کی تھی تو وہاں کی فوج نے امریکہ کے زیر اثر اور فرانسیسی حکومت کے کہنے پر وہ الیکشن منسوخ کرا دیے تھے۔ لیکن اب جبکہ ان ممالک میں اسلامی جماعتیں کئی انتخابات جیت چکی ہیں ہم دیکھتے ہیں کہ وہاں کی افواج کی جانب سے ایسی کوئی پر تشدد مداخلت دیکھنے میں نہیں آتی۔

جواب: آپ نے ایک بہت ہی اہم سوال اٹھایا ہے اور مجھے خدشہ ہے کہ یہ جو مختصر سا وقت مجھے میسر ہے میں اس کے ساتھ انصاف نہیں کر پاؤں گا۔ مگر سب سے پہلے مجھے کہہ لینے دیجیے کہ یہ تصورِ امت صرف جمال الدین افغانی کی خدمات ہی میں نہیں بلکہ یہ تصور تو روز اول سے موجود ہے۔ ہاں مجھے اس بات سے اتفاق ہے کہ اس کی تفصیل میں اختلافات ضرور ہوئے ہیں اور میں اس بات کو بھی مانتا ہوں کہ پہلی صدی کے اندر اندر ہی سیاسی طاقت کے مرکز تقسیم ہو گئے تھے۔ مگر اس کے باوجود تاریخ میں ہمیں امت میں اتحاد کا رجحان نظر آتا ہے، اور آج بھی جو دنیا میں گھوما پھرا ہو، اس کے اثرات اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے، وہ جہاں بھی جائے۔ آپ ملائیشیا جائیں، آپ وہاں کی زبان سے ناواقف ہیں، لیکن جس لمحے آپ نے کہا 'السلام علیکم'، صورتحال بالکل مختلف ہو جاتی ہے۔ آپ ترکی کے دیہاتوں میں چلے جائیں آپ دیکھیں گے کہ صرف یہ بات جاننے سے کہ ایک مسلمان ان کے پاس آیا ہے ان کا رویہ اجنبی کے بجائے دوست کا ہو جاتا ہے۔ یہ اسلام کی وحدانیت ہے۔ مگر جہاں تک اظہار، بول چال، تحریک یا زبان کا تعلق ہے، تو ہاں ان میں فرق ضرور ہے۔ میں نے بہت سے عرب ممالک کا سفر کیا ہے، الحمدللہ تقریباً آدھی اسلامی دنیا دیکھ چکا ہوں اور میں آپ کو بتا سکتا ہوں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کہ امت کا یہ تعلق، یہ وحدانیت ہر جگہ موجود ہے۔ اس کے باوجود اسلام کی خوبصورتی اس میں ہے کہ تنوع میں اتحاد ہو۔ اس نے ہر فرد کو یہ موقع دیا ہے کہ اپنا، اپنی زبان کا، ثقافت اور حالات کا اظہار کرے۔ مگر ان کے درمیان صرف ایمان اور اقدار ہی میں مماثلت نہیں بلکہ سنت پر عمل کی وجہ سے وہ ایک طرز زندگی میں بھی شراکت کر رہے ہوتے ہیں۔ تاریخ میں سنت کا اس وحدانیت میں ایک بہت بڑا کردار رہا ہے جو اس تنوع کے ساتھ بھی موجود ہے۔

موجودہ بیداری کے حوالے سے میں ڈاکٹر اعوان سے اتفاق کرتا ہوں کہ یہ ایک بہت اہم پیش رفت ہے، یہاں تک کہ ترکی بھی اس سے گزر رہا ہے۔ کس طرح وہ ایک جارحیت پر مبنی، بلکہ اگر میں کہوں پر تشدد سیکولرازم سے اس مقام پر آ کھڑا ہوا ہے جہاں سیکولرازم رسمی طور پر تو موجود ہے مگر وقت کے ساتھ ساتھ انتہائی کمزور پڑ گیا ہے۔ اسی چیز کا نام حکمت ہے کہ پہلے آپ حالات اور صورت حال کا جائزہ لیتے ہیں اور پھر کوئی حل ڈھونڈتے ہیں۔ میرے خیال میں یہ واقعات اسلام کے احیاء کے لیے بہت ہی قیمتی اور اہم ہیں اور مستقبل کے لیے راہ ہموار کر رہے ہیں؛ میں ان لوگوں میں سے ایک ہوں جن کا یہ خیال ہے کہ پاکستان کی تحریک اسلامی کے لیے ان تجربات میں سے سیکھنے کے لیے بہت کچھ ہے، ہم اس کی طرف سے آنکھیں بند نہیں کر رہے ہیں۔ مگر ہر ملک کے اپنے تاریخی حالات، دشواریاں اور تنظیمی مسائل ہوتے ہیں۔ میں آپ کے تحفظات کو مسترد نہیں کر رہا ہوں، جزوی طور پر مجھے ان سے اتفاق ہے، مگر میں اس حوالے سے کافی پر امید ہوں کہ اسلامی احیاء کی تحریک دنیا بھر میں آگے بڑھ رہی ہے۔

پاکستان میں بھی ہم نے اتحاد اور تعاون کی سیاست کا تجربہ کیا ہے۔ ہمیں ایک منفرد صورت حال سے سابقہ درپیش ہے جہاں سوائے چند کے تمام اسلامی جماعتوں کو اسلامی جماعتوں کے طور پر ہی دیکھا جاتا ہے، وہ سب یہی کہتی ہیں کہ اسلام ہمارا نصب العین ہے۔ اور جب وہ ووٹر کے پاس جاتی ہیں تو انتخاب اسلام اور غیر اسلام کے درمیان نہیں رہتا۔ اس لیے اس پیچیدگی کی وجہ سے آپ انتخابی نتائج سے بہت کچھ حاصل نہیں کر سکتے، لیکن پھر بھی جب کبھی اسلامی قوتوں نے اتحاد کیا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے ان کی حمایت انتخابی فتوحات کی صورت میں سامنے آئی ہے۔ تو میرے خیال میں ایسی صورت حال میں ایک سماجی ماہر کو ہر پہلو کا تجزیہ کرنا پڑے گا۔ لیکن مشرق وسطیٰ کے منظرنامہ میں جو حالیہ پیش رفت ہوئی ہے اس میں میں فوج، سیکولر قوتوں اور بیرونی طاقتوں کے کردار سے کچھ زیادہ پرامید نہیں ہوں۔ وہاں میدان اب بھی کھلا ہے، فوج بہت ہوشیاری سے اپنے پتے کھیل رہی ہے، اور مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ اسلامی قوتوں نے بھی جواب میں کمال درجہ سیاسی فراست کا مظاہرہ کیا ہے۔ ترکی کو دیکھیے، ایک وقت تھا کہ جیسے ہی ان کو ذرا بھی شبہ ہوتا کہ اسلامی طاقتیں سر اٹھا رہی ہیں، وہ مداخلت کر دیتے۔ کس طرح انہوں نے اربکان کو کنارے سے لگایا اور اسے سیاست سے بے دخل کر دیا۔ مگر آج آرمی کے ایک تہائی موجودہ جرنیل یا تو جیل میں ہیں یا ان پر مقدمات چل رہے ہیں۔

لہٰذا صورت حال اب تبدیل ہو رہی ہے۔ ہمیں اپنے آپ کو حالات کے مطابق ڈھالنا ہو گا، اور میں اس بات سے اتفاق کرتا ہوں کہ جب تک اسلامی تحریکیں لوگوں کو ان کے موجودہ مسائل کا حل نہیں بتائیں گی، ہمارا تقسیم شدہ ووٹ ہمیشہ محدود رہے گا۔ ہمیں پاکستانی معاشرے کی ساخت، یہاں کے برادری سسٹم، لوگوں کی جہالت، ذاتی مفادات، تھانہ کلچر، کچہری کلچر، ان سب چیزوں کو ذہن میں رکھ کر کوئی راستہ ڈھونڈنا ہو گا۔ ایف آئی ایس نے یہ کیا تھا اور ۸۰ فیصد ووٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی، مگر پھر کیا ہوا۔ فوجی ایکشن کے نتیجے میں ایک لاکھ سے زائد لوگ ہلاک ہو گئے اور ایک پرامن، سیاسی تحریک کو پرتشدد تحریک میں تبدیل کر دیا گیا۔ اس لیے ہمیں ان سب چیزوں کو ذہن میں رکھنا ہو گا؛ ڈاکٹر اعوان نے جس تشویش کا اظہار کیا ہے میں اس سے کافی حد تک متفق ہوں؛ اور میں اس بات کو مانتا ہوں کہ اسلامی تحریکیں چاہے وہ دنیا کے کسی بھی حصے میں ہوں ان کو زمینی حقائق کو سمجھنا ہو گا: ان کو مختلف طریقوں سے مسائل کو حل کرنا ہو گا۔ ایک نظریاتی پوزیشن ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ ہم ان حقائق کو نظرانداز کر دیں۔ اور اگر ہم ان کا حل ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ان منفرد مشکلات اور رکاوٹوں کے باوجود کوئی نہ کوئی راستہ ضرور نکلے گا۔ باوجود اس کے کہ میں صورت حال کو آسان بنا کر نہیں دیکھنا چاہتا، میں اس حوالے سے کافی پرامید

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہوں۔

تبصرہ وسوال (ڈاکٹر نذیر حسین): میں آئی پی ایس کو وقت کی اس سب سے اہم گفتگو اور پاکستان بھر میں اس مسئلے پر سیمینارز منعقد کرانے پر مبارکباد دیتا ہوں؛ میں پروفیسر صاحب کی اس بات کی تائید کرتا ہوں کی اس طرح کے لیکچرز ہوتے رہنے چاہئیں، میں گزارش کروں گا کہ اگلا لیکچر اسلام کے عالمی نقطہ نظر کے حوالے سے رکھیں، کیونکہ اس کی ضرورت ہے، اور اس حوالے سے کام بھی کم ہو رہا ہے۔ ہوسکتا ہے لوگ اس بارے میں جانتے ہوں مگر تشنگی موجود ہے۔ میں پہلے اپنے کچھ مشاہدات پیش کروں گا اور پھر تین سوالات اٹھاؤں گا۔

تاریخی تناظر میں ہمیں دو حوالوں سے بہت محتاط ہونا پڑتا ہے۔ سیّد مودودی کے مطابق اسلام کو جاننے کے دو تناظر ہیں: اسلام اور مسلمان۔ ایک وہ اسلام جو حکمرانوں اور بادشاہوں کے ذریعے تھا اور دوسرا جو لوگوں کی طرف سے تھا۔ اسی تناظر میں مغرب بھی کسی ایک تصور کا نام نہیں ہے۔ اب اس میں فرق ہے، یہ صرف یورپ کا نام نہیں ہے۔ میں یورپ میں سفر کرتا رہا ہوں، میں وہاں ایک سال گزار چکا ہوں؛ فرانسیسیوں کا نقطہ نظر الگ ہے، جرمنوں کا الگ ہے، اسی طرح امریکیوں اور برطانویوں کا الگ ہوسکتا ہے۔ یہ ایک چیز ہے جو میں نے محسوس کی ہے۔ میرا دوسرا مشاہدہ یہ ہے کہ ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ جب ہمارا سنہرا دور تھا تو یورپ اس وقت تاریکی میں تھا۔ تو جس طرح پروفیسر صاحب نے اس طرف اشارہ کیا، مسئلہ ہمارے اندر ہی ہے، ہم نے کہیں نہ کہیں کسی چیز کو بھلا دیا ہے۔ اس لیے جب یورپ میں نشاۃ ثانیہ کا آغاز ہوا تو مسلمان تاریکی میں چلے گئے۔ اس میں مغرب کا کوئی قصور نہیں ہے، خرابی شاید ہمارے ہی اندر ہے۔ اس کی عملی مثالیں بھی موجود ہیں مگر میں تفصیلات میں نہیں جاؤں گا۔ لیکن پروفیسر صاحب نے جو دوسرا نقطہ اٹھایا اس کی وضاحت کی ضرورت ہے، تلوار کے ذریعے اسلام کا پھیلاؤ یا تبلیغ کے ذریعے۔ مجھے اقبال کا ایک شعر یاد ہے:

میں تجھ کو بتاتا ہوں ، تقدیرِ امم کیا ہے
شمشیر و سناں اول، طاؤس و رباب آخر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مگر اب یہ ترتیب بدل گئی ہے۔ کیا 'رباب' اور 'طاؤس' 'شمشیر و سناں' سے پہلے نہیں آ گئے ہیں؟

پھر غلط فہمیاں، دونوں طرف غلط فہمیاں، اور مجھے نہیں معلوم یہ پہلے سے طے شدہ ہے یا اسے بنایا گیا ہے۔ پروفیسر صاحب نے ایک بہت ہی بنیادی ذریعے کو چھوڑ دیا ہے جو غلط فہمی پیدا کرنے میں مددگار رہا ہے، یعنی میڈیا۔ میرے خیال میں پچھلی کئی صدیوں میں چیزوں کو بنانے اور تشکیل دینے میں میڈیا نے ایک تباہ کن کردار ادا کیا ہے؛ اسامہ ہیرو تھا، وہ زیرو ہو گیا۔ صدام امریکیوں کا ڈارلنگ تھا اور وہ ایک درندہ بن گیا۔ اس لیے میڈیا نے اسلام اور مسلمانوں کے حوالے سے سماجی اور ریاستی تصورات کی تشکیل میں نہایت کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ یہاں پر میں ایک مسلمان عالم علی مزروعی کا ایک حوالہ دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ وہ کہتے ہیں کہ ''مسلمانوں نے تاریخ میں تبدیلی کے لیے خاموش اور بالواسطہ کردار ادا کیا ہے''۔ وہ دو مثالیں دیتے ہیں؛ ایک، یورپ تبدیل ہوا کیونکہ فرانس تبدیل ہوا، اور فرانس میں الجزائر کی جنگ آزادی کی وجہ سے تبدیلی آئی تھی۔ وہ کہتے ہیں کہ سوویت یونین کا شیرازہ بکھیرنے میں افغان مجاہدین کا ایک بہت بڑا کردار رہا ہے۔ اس لیے مزروعی کے مطابق ہم تشکیل دینے والے رہے ہیں، ہم نے عالمی تاریخ کو ایک شکل دی ہے، مگر بہت ہی خاموش اور بالواسطہ طریقے سے۔ مگر ان کا سوال بہت موزوں ہے، ''کیا ہم اس جہاز کے کپتان ہو سکتے تھے؟''

ہم ایک عالمی دنیا میں رہ رہے ہیں۔ جہاد ضرور موجود ہے، مگر ہم نے 'ڈی جہادائزیشن' بھی شروع کر دی ہے۔ پاکستان اور پاکستانی ابھی تک اس مخمصے کا شکار ہیں کہ آیا یہ جہاد ٹھیک ہے یا وہ جہاد ٹھیک ہے، نام نہاد 'روشن خیال اعتدال پسندی'۔ میں نے ایک فرانسیسی اسکالر کے ساتھ روشن خیال اعتدال پسندی پر ایک مضمون لکھا تھا اور مجھے یہ شرف حاصل ہے کہ میں نے اس حوالے سے پروفیسر صاحب کا ایک انٹرویو لیا تھا۔ انتہا پسندی یورپ میں بھی موجود ہے، جیسے اوسلو فائرنگ کا واقعہ، مگر اس کا ذمہ دار مجرم بنیاد پرست نہیں تھا، وہ ایک الٹرا آرتھوڈوکس عیسائی تھا جو کسی بات کا بدلہ لینا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

چاہتا تھا۔ ابھی گزشتہ روز ہی فرانس کے کسی ایک قصبے میں تین یہودی قتل کر دیے گئے۔ یعنی انتہا پسندی کے واقعات ان کے ہاں بھی ہوتے ہیں۔ ہم بلا شبہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے یہ جانتے ہیں کہ جس نے ایک انسان کو ہلاک کیا گویا اس نے پوری انسانیت کو ہلاک کیا۔

آخر میں میرے تین سوالات ہیں۔ مغرب میں وال اسٹریٹ موومنٹ نامی ایک تحریک ہے۔ بد قسمتی سے پاکستانی میڈیا میں اس کا کوئی ذکر نہیں۔ تو اس کا مطلب ہے کمیونزم اور اب کیپٹل ازم کی موت ہوگئی؟ اس کا مطلب ہے سرمایہ داری سے لوگ اب تنگ آ چکے ہیں؟ لیکن گزشتہ ۲۵ سال سے اسلامی تاریخ اور سیاسی تاریخ کا ایک طالب علم ہونے کی حیثیت سے میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ سرمایہ داری اور کمیونزم کا متبادل کیا ہوسکتا ہے۔ ہمارے پاس تین ماڈل ہیں؛ سعودی بادشاہی اسلام، ایرانی انقلابی اسلام اور ترک سیکولر اسلام۔ اسلام کا اصل ماڈل کہاں ہے، کدھر ہے ریاست مدینہ؟ اور اس سے پھر وہ سوال ذہن میں آتا ہے جو اعوان صاحب اٹھا چکے ہیں۔ ہمارے ہاں یقیناً ایک امت کا تصور تھا۔ مگر میں یورپ میں رہ چکا ہوں؛ ایک ویزا، ایک کرنسی، ۲۸ ممالک۔ اگر آپ امت کے کسی شہر میں جائیں تو آپ کو ویزا کی ضرورت پڑتی ہے، آپ کو ڈالر، پاؤنڈ یا یورو میں کرنسی چاہیے ہوتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ اسلام کی عالمگیریت کہاں ہے؟

اور میرا دوسرا سوال یہ ہے کہ ہنٹنگٹن اور فوکویاما کا متبادل نظریاتی نقطہ نظر کہاں ہے؟

ہماری تین مسلم ریاستوں پر حملہ کیا گیا اور چوتھی ایران کی صورت میں تیار ہے۔ ہاں، ہمارے ساتھ گوانتاناموا اور ابوغریب جیل کے مسائل بھی ہیں، مگر اس کا جواب تشدد اور دہشت گردی نہیں ہے۔ ہمارا ایک نقطہ نظر ہونا چاہیے، ایک علمی اور نظریاتی نقطہ نظر۔ میرا آخری سوال یہ ہے کہ اسلامی نظریہ (اسلامزم) کہاں ہے، کیا ہم اسلام کو ان نظریات میں تلاش کریں یا ہمیں ان نظریات کو اسلام میں تلاش کرنا پڑے گا؟

جواب: میں مشاہدات پیش کرنے پر آپ کا شکر گزار ہوں؛ آپ نے یقیناً کچھ موضوعات

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پر روشنی ڈالی جن پر میں نے بات کی یا نہیں کر سکا۔ میں میڈیا کے کردار سے بات شروع کروں گا، آپ نے ٹھیک کہا کہ کسی تاثر کو بنانے یا بگاڑنے میں میڈیا کا کردار لاکھوں گنا بڑھ گیا ہے، چند گنا نہیں، لاکھوں گنا، اور ابھی ہم بہت پیچھے ہیں۔ یہ بات میرے لیے حد درجہ باعث تشویش ہے، کیونکہ میڈیا کیا ہے، میڈیا تو 'ابلاغ' کا ذریعہ ہے، اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد اور مشن بھی ابلاغ تھا۔ معجزہ، کو ایک انسان کی نبوت کی آخری اور ناقابل تردید دلیل کہا جاتا ہے، اور حضرت محمدؐ کا معجزہ قرآن ابلاغ پر حرف آخر کا مقام قیامت تک کے لیے رکھتا ہے۔ المیہ یہ ہے کہ ہم ہر کسی سے پیچھے ہیں، اس لیے میں آپ کی تشویش میں برابر کا شریک ہوں۔ یہ ایک بہت بڑا چیلنج ہے جس کا ہمیں جواب دینے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ''اسلام اوپر سے نافذ ہوگا یا نیچے سے؟'' ایسے مسائل ضرور ہیں، مگر ہمیں ان میں زیادہ نہیں الجھنا چاہیے۔ آپ دیکھیں کہ سب سے بڑی نعمت قرآن ہمارے پاس ہے اور ہر وقت اور ہر جگہ اپنا مطلب بیان کر رہا ہے۔ سنت ایک زندہ حقیقت ہے اور محض ایک خیالی تصور نہیں ہے۔ سواد اعظم الحمدللہ ہمیشہ سیدھے راستے پر رہا ہے، چاہے انارکی پسندوں کو کتنی ہی بالادستی کیوں نہ حاصل ہو۔ امام احمد بن حنبل جیسے لوگوں کو سزائیں دی گئیں، امام ابن تیمیہ جیل میں انتقال کر گئے، یہ بھی ہماری تاریخ کا حصہ ہے۔ لیکن الحمدللہ اسلام کے پیغام اور اس کے وژن کو پھیلنے سے نہیں روکا جا سکا اور اس سلسلے میں اسلامی تاریخ میں تجدید و احیائے دین کا پورا ایک باب ہے۔

دوسری تہذیبوں کی بات کی جائے تو تاریخ ۳۶ معلوم تہذیبوں کا ایک قبرستان ہے۔ اسلامی تاریخ میں آپ کو نشیب و فراز نظر آئیں گے، مگر ہر زوال کے بعد ہمیں احیا نظر آتا ہے۔ اس لیے میرے خیال میں یہ فرق ہے۔ اسلام کا سنہری دور اور یورپ کا تاریک دور ایک حقیقت ہے؛ اور مغرب میں تحقیق، تعلیم، سائنس اور ٹیکنالوجی اور آج ہمارا زوال بھی ایک حقیقت ہے۔ لہٰذا آپ دیکھتے ہیں کہ ہمارا اپنی تاریخ کے بارے میں ایک نقطہ نظر ہے، اور شاید یورپ کو بھی اپنی تاریخ کے حوالے سے ایک نقطہ نظر کی ضرورت ہے۔ مجھے نہیں معلوم آپ کو علم ہے یا نہیں، چند ہفتے پہلے جو ناتھن لیونز کی ایک کتاب ''اسلام، مغرب کی نظر سے'' (Islam Thrgough Western

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(Eyes آئی ہے، بہت ہی دلچسپ ہے۔ مجھے اس میں سے کچھ اقتباسات پیش کرنے کی اجازت دیجیے تاکہ ہمیں کم از کم یہ احساس ہو سکے کہ جہاں ایک طرف ہم اپنے ناقد خود بننے کی کوشش کر رہے ہیں، جو کہ ہمیں ہونا بھی چاہیے، وہیں دوسرے بھی اپنی اس دانشورانہ اور سیاسی روایت پر کم از کم نظر ثانی کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جس میں وہ ایک لمبے عرصے سے رہ رہے ہیں۔

''اس بنیادی اہمیت کے نکتے کو سمجھ لیا جائے کہ مغرب میں علوم کی ترقی اسلامی سائنس اور فلسفے کی مرہونِ منت ہے تو ہم حقائق کو تسلیم کرنے کی سمت چل سکیں گے اور اس ضرورت کا احساس بھی ابھر کر سامنے آئے گا کہ نظریات کی ساری تاریخ کا از سرِ نو جائزہ لے کر اپنی سوچ کی اصلاح کی جائے۔ ہم یہ ادراک بھی کر سکیں گے کہ اسلام کو موروثی طور پر تشدد آمیز مذہب ثابت کرنے کا تصور کس گمراہ کن سوچ کا تابع ہے اور یہ کہ اس سوچ اور تصور نے کس طرح مغرب کی تفہیم پر تباہ کن اثرات مرتب کر کے اس سارے کھیل کے پیچھے موجود اپنے مقاصد اور مفادات کو چھپا لیا ہے۔ ہمیں یہ تسلیم کر لینا چاہیے کہ اسلامی معاشرے میں مرد اور عورت کے تعلقات کے بارے میں کوتاہ بینی پر مبنی ہماری سوچ نے اسلام کے غیر مغربی جدت پسندی کے نظریہ پر قدغن لگا دی ہے۔ یہ کام اس بات کا متقاضی ہے کہ مشرق اور مغرب کے روایتی تعلقات کو وسیع تر پیرائے میں منتقل کیا جائے اور بین الثقافتی دشمنی کو باہم ثقافتی مقابلہ کی صورت دے دی جائے۔ مشرق اور مغرب کو سرحدوں کی حد بندی میں تقسیم کرنے کے بجائے ہمیں چاہیے کہ اب وسیع مواقع فراہم کریں جہاں ایک دوسرے کے خیالات کو اثر پذیر ہونے کا موقع ملے اور دنیا بھر میں اس کے اثرات مرتب ہو سکیں۔ اس منتقلی کے نتیجے میں ہم ان خیالات کی طرف واپس پلٹ سکیں گے جن کا اظہار نظریات کی تاریخ پر مرتب ایک انتہائی قابلِ ذکر اٹلس میں مسلمان دانشور محمد الادریس نے ۱۲ویں صدی میں کیا تھا۔''

آخر میں وہ کہتے ہیں کہ:

''مغرب کے ثقافتی نظریات کے درمیان اسلامی تہذیب کے لیے کشادگی پیدا کرتے ہوئے ہمیں اچانک دونوں کے باہمی تعلقات میں نئی سرحدوں کا سامنا کرنا پڑ جاتا ہے۔ دونوں تہذیبوں کے درمیان ثقافتی تعلقات میں جاری و ساری رابطے ایک ہزار سال پہلے منقطع ہو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

گئے تھے اور پھر یہ کہنا مشکل ہے کہ کس نے کہاں تعلقات کا اختتام کیا تھا اور کس نے کہاں سے آغاز کرنا ہے۔ یہ وہ نمونہ ہے (میں چاہتا ہوں کہ اس جملے پر خصوصی توجہ دی جائے) جو اسلامی تاریخ کے گم گشتہ اوراق کی از سر نو تدوین کا باعث بنے گا جو اسلام مخالف بحثوں کے دوران حدود و قیود سے آزاد ابواب میں بیان کی گئی خامیوں کا ازالہ کر سکے گا لیکن سب سے پہلے ہمیں بہر صورت مغرب کے متنازع فیہ سوال کو یکسر نئے پیرائے میں بیان کرنا چاہیے یعنی اسلام کے ساتھ کیا غلط ہے؟ کی بجائے ایک ہلکے پھلکے سوال کا رخ دینا چاہیے کہ ہمارے ساتھ کیا غلط ہے؟''

اس لیے میں یہ کہہ سکتا ہوں عالمی پس منظر سے متعلق آپ کے سوال کے جواب میں یہ مدد دے گا۔ جہاں تک اسلام کی بذریعہ تلوار یا اس کے بغیر اشاعت کا تعلق ہے تو میں اس حوالے سے اپنی تقریر میں بات کر چکا ہوں۔ تلوار کا ایک اپنا مقام ہے، اس میں کوئی شک نہیں، اور ہمیں اس بارے میں لگی لپٹی کے بغیر بات کہنی چاہیے۔ مگر تلوار معصوم کے قتل کے لیے بھی استعمال کی جا سکتی ہے اور مظلوم کی حفاظت کے لیے بھی۔ سوال یہ ہے کہ اسے کس طرح اور کس مقصد کے لیے استعمال ہونا چاہیے۔ اقبال نے بالکل ٹھیک کہا ہے کہ ابھرتی ہوئی تہذیبوں کے ہاں محنت، جد و جہد، کوشش، قربانی، وسائل کی تنظیم اور طاقت جیسی خصوصیات ہوتی ہیں؛ اور زوال کی خصوصیات میں دماغ پر طاری رہنے والے خیالی تصورات ہوتے ہیں، یہ آپ کو زندگی کی تلخ حقیقتوں کا سامنا کرنے سے روکتے اور آسائشوں کی دنیا میں لے جاتے ہیں۔ تو یہ ایک حقیقت ہے اور ہمیں اس سے شرمانا نہیں چاہیے۔ لیکن جیسا کہ میں اس بات کی طرف اشارہ کرنا چاہ رہا ہوں کہ یہ ایک بہت ضروری بحث ہے کہ تلوار کا کئی بار غلط استعمال کیا گیا ہے اور اب بھی کیا جا رہا ہے؛ اور مسلم دنیا سمیت پورے عالم میں یہی صورت حال ہے۔ اس لیے ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم سیدھے راستے اور اخلاقی فرائض کی وضاحت کریں، اس کے بعد ہی تلوار لعنت کے بجائے ایک نعمت بن سکے گی۔

آپ کے دوسرے سوالوں سے متعلق میری رائے یہ ہے کہ وال اسٹریٹ پر قبضہ کی تحریک ایک بہت اہم مگر منطقی پیش رفت ہے۔ سوویت یونین کے بکھرنے، دیوار برلن کے گرنے، کمیونزم اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اشتراکیت سے پیدا ہونے والی مایوسی اور نظر فریبی کی کیفیت دور ہو جانے کے بعد ہم نے دیکھا کہ کس طرح مغربی لبرل ازم کی حتمی اور نا قابل واپسی کامیابی کے بارے میں شیخیاں بگھاری جا رہی تھیں، سیاسی و اقتصادی دونوں میدانوں میں۔ لیکن صرف بیس سال بعد آج کا سب سے بڑا مسئلہ ایک فیصد کا ننانوے فیصد پر غلبہ ہے۔ لیکن آپ نے صحیح کہا کہ پاکستان میں اس کی مناسب آگہی تک نہیں، اور یہ ظاہر کرتا ہے کہ کس طرح ہمارا میڈیا پاکستانی عوام کو اس مسئلے کا شعور دلانے میں ناکام رہا ہے جس نے لوگوں کے ذہنوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے۔ گو یہ مسئلہ نیا نہیں ہے، وال اسٹریٹ پر قبضہ کی تحریک اس کی انتہا کو ظاہر کرتی ہے۔ چار سالہ بحران، عالمی اسٹاک ۴۰ ٹریلین ڈالرز کی سطح پر آ گیا ہے اور ماحول گمبھیر ہو رہا ہے۔ المیہ یہ ہے کہ جہاں ایک طرف کئی بلین ڈالرز بنکوں کو بچانے میں لگا دیے گئے، وہی بنک جن کی لالچ اور بدعنوانیاں بحران کا سبب تھیں، مگر دوسری طرف امریکہ میں موجود گھروں کے وہ دو ملین مالکان جو قرض ادا نہ کر سکنے کے باعث گھر خالی کرنے پر مجبور تھے، انہیں کوئی مدد فراہم نہیں کی گئی۔ انوسٹمنٹ گھروں اور بنکوں کی تباہی اور امدادی کارروائیوں سے جو عمل شروع ہوا تھا وہ ریاستوں کے دیوالیہ تک پہنچ گیا ہے۔ آئرلینڈ، آئس لینڈ، یونان اور اسپین اسی صورت حال سے دوچار ہیں۔

مگر بدقسمتی سے اپنے ملک میں ہم چھوٹے موٹے مسائل میں الجھے ہوئے ہیں، اور وہ باتیں جن پر پوری انسانیت کا دارومدار ہے، ہمارا میڈیا اور ہمارے دانشوران پر بات نہیں کرتے اور یہ ایک بہت بڑی کوتاہی ہے۔ مگر میں بڑی عاجزی سے کہنا چاہوں گا کہ ہمیں اتنا شائستہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے کہ ہم کہیں کہ اس کا متبادل موجود نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ متبادل پر بہت کچھ کام ہوا ہے۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں کہ یہ متبادل ایک عملی نمونے کے طور پر موجود نہیں، میں اس بات کی تائید کرتا ہوں، اور یہی ایک بہت سنگین مسئلہ ہے۔ کیونکہ مکہ میں نبوت کے بعد تیرہ سال کی محنت اور صرف چند ہزار لوگ؛ اور پھر مدینہ میں قائم کیے ہوئے دس سالہ نقشے کی بدولت ہم صرف ایک صدی کے اندر اندر دنیا کے تین براعظموں میں پھیل گئے، اور اس وقت کی سپر طاقت کے طور پر ابھر کر سامنے آئے؛ وہ تھا اصل ماڈل۔ سعودی شاہی ماڈل ہمارا ماڈل نہیں ہے۔ ایرانی ماڈل میں کچھ اچھے پہلو ضرور موجود ہیں،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مگر میرے نقطہ نظر کے مطابق وہ بدقسمتی سے اسلامی نمونے سے کافی دور ہے۔ ترکی میں، جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ سیکولرازم اپنے اچھے دن گزار چکا ہے، مگر وہاں عوام نے کبھی اس کو دل سے قبول نہیں کیا۔ ایک ایسے دور سے جب سیکولرازم بندوق کے زور پر نافذ تھا اور شریعت اور اسلامی اصول و اقدار لوگوں کو دینے سے انکاری تھا، اب ایسی صورت حال پر آ گیا ہے جہاں وہ کہتے ہیں کہ سیکولرازم موجود ہے مگر غالب اور آمرانہ انداز میں نافذ کیے ہوئے اصول کے طور پر نہیں، بلکہ دوسروں کو آزادی دینے کے حوالے سے۔ میری نظر میں یہ ایک حالت سے دوسری حالت میں تبدیلی تھی، اس میں وقت لگتا ہے، مگر وہ ماڈل ناکام ہو چکا ہے؛ اور اب بالخصوص اربکان اور اردگان کی کوششوں سے ترکی کی شکل میں ایک نیا ماڈل سامنے آرہا ہے اور یہ حالیہ قدم اس منزل کی جانب ایک سنگ میل ہے۔

نظریاتی سطح پر، میرے خیال سے بیسویں صدی بڑے مفکرین کی موجودگی کے باعث ایک نعمت رہی ہے جس میں جمال الدّین افغانی، محمد عبدہ، اقبال، مولانا مودودی، سید قطب، مالک بن نبی اور عصر حاضر میں یوسف القرضاوی، اور راشد الغنوشی شامل ہیں۔ میرے خیال میں ان لوگوں نے کافی کام کیا ہے۔ نظریاتی سطح پر اگر آپ پاکستان، ایران اور سوڈان کے دساتیر کی دفعات کا موازنہ کریں، جن کو یقیناً میں مثالی نہیں کہتا، مگر آپ دیکھیں گے کہ نظری حیثیت میں اس متبادل کے مقاصد، شکل اور جہات کافی حد تک ان میں موجود ہیں۔ مگر ہم اس کو عملی صورت دینے میں ناکام ہیں۔ میں اور میرے ساتھیوں نے مل کر اسلامی معاشیات کے شعبے میں ترقی کے لیے جو حصہ ڈالا ہے، پچاس سال پہلے یہ صرف ایک خواب تھا۔ جب ایک طالب علم کے طور پر میں اسلامی معاشیات کی طرف مائل ہوا تھا تو اس وقت اس کا کوئی واضح مقصد نظر نہیں آتا تھا۔ مگر پچھلے پچاس برسوں کی محنت کے بعد آپ نے دیکھا ہوگا کہ اسے کُل اقتصادی مسئلے کے متبادل نقطہ نظر کی حیثیت سے تسلیم کیا جارہا ہے؛ مگر ابھی ہماری منزل بہت دور ہے، اور متبادل موجود ہے۔ مجھے یہ صاف صاف کہنے دیجیے کہ اگر ہمیں کہیں کمی یا کمزوریاں نظر آتی ہیں تو شکایتیں کرنے کے بجائے یہ ہم دانشوروں کی ذمہ داری ہے کہ اپنے اپنے شعبوں میں کام کریں، اس کمی کو پورا کریں، اور پھر اسے پیش کر کے مکالمہ اور تبادلہء خیال کریں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسلامی معاشیات کے حوالے سے ہم آٹھ عالمی کانفرنسیں کر چکے ہیں جن میں علماء، مسلم ماہرین اقتصادیات اور مغربی ماہرین اقتصادیات نے شرکت کی۔ اسلامک فاؤنڈیشن برطانیہ لخبرہ یونیورسٹی (برطانیہ) میں ہونے والی کانفرنس میں کو-اسپانسر تھی جس میں نامور برطانوی ماہرین معیشت نے شرکت کی۔ لہٰذا بحث جاری ہے کہ متبادل کس طرح سامنے آئیں گے۔

میں آپ کی توجہ اس بات کی طرف دلانا چاہوں گا کہ روشن خیالی کی فکری تشکیل ایک ہی دن میں سامنے نہیں آ گئی تھی، دوصدیوں پر پھیلے ہوئے درجنوں مفکرین اس کے پیچھے ہیں۔ اگرچہ ہم ایڈم اسمتھ کو معاشیات کا بانی کہتے ہیں، اس کی کتاب کا طبع ہونا اس کوشش کا اختتام نہیں تھا۔ معاشیات پر پہلی درسی کتاب کو آنے میں سو سال کا عرصہ لگا جو کہ آکسفرڈ کی جانب سے مارشل کی ''ٹیکسٹ بک آف اکنامکس'' تھی۔ اقتصادی سوشلزم؛ آپ مارکس کو پڑھیے، داس کیپٹال اشتراکیت کی نہیں، سرمایہ داری کی معاشیات ہے، کمیونسٹ مینی فیسٹو، کریٹیک آف دی گوتھا پروگرام؛ آپ کو ان میں کہیں اشتراکی معاشیات نہیں ملے گی۔ اشتراکی معاشیات روسی انقلاب کے تقریباً پندرہ سال بعد سامنے آنا شروع ہوئی؛ یہ ۳۳-۱۹۳۲ء کی بات ہے جب اقتصادی اشتراکیت پر پہلی کتاب منظر عام پر آئی۔ مارکس کی کتابوں میں آپ کو منصوبہ بندی کا لفظ تک نظر نہیں آئے گا، لیکن پھر یہ ایک بنیادی چیز بن گئی اور اوسکر لانج جیسے یورپین ماہرین اقتصادیات نے اقتصادی معیشت کا ایک پورا نظریہ تیار کیا۔ لہٰذا متبادل موجود ہوتے ہیں پہلے ایک خیال کی صورت میں، پھر وہ خیال ترقی پاتا ہے اور ایک سوچ بن جاتا ہے، پھر ایک نقطہ نظر، ایک وژن بنتا ہے، اس کے بعد ہمارے پاس کچھ علمی مواد آتا ہے، اور پھر لٹریچر تیار ہوتا ہے، نصابی کتب بنتی ہیں اور اس طرح ہم ایک علمی شعبے کی تشکیل کرتے ہیں۔ ہم اس وقت اسی ارتقاء کے عمل سے گزر رہے ہیں۔

سوال (ایک طالب علم): جناب میرا سوال ایک خاص اصطلاح یعنی 'اسلام کے سافٹ امیج' سے متعلق ہے۔ ہم اکثر اسے سنتے ہیں، خصوصاً ۹/۱۱ واقعے کے بعد۔ میرا سوال یہ ہے کہ اس کے پیچھے کیا مقصد کارفرما ہے اور ہمیں اس اصطلاح سے کیا مطلب مراد لینا چاہیے؟

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جواب: اسلام کے سافٹ امیج کا معاملہ میرے نزدیک ایک سوچی سمجھی کوشش کے تحت ہے جس کا مقصد مسلمانوں کو آپس میں بانٹنا اور ایک 'اصلاح شدہ اسلام' پیدا کرنا ہے، یعنی اپنی اصلاح اسلام کی روشنی میں نہیں بلکہ اسلام کی اصلاح۔ لیکن یہ کوشش ماضی میں بھی ہو چکی ہے؛ اس نے کچھ لوگوں کو ضرور گمراہ کیا مگر ہماری تاریخ کو صحیح راستے سے نہیں ہٹا سکی۔ میرے علم کی حد تک یہ اصطلاح سب سے پہلے پروفیسر نائے نے استعمال کی تھی؛ ہارڈ پاور اور سافٹ پاور، فوجی طاقت اور علمی کوشش۔ تو یہ اس طرح متعارف ہوئی تھی، مگر اب اس کا استعمال بدل دیا گیا ہے؛ کہا جاتا ہے کہ انڈونیشیا کا اسلام سافٹ اسلام ہے، ملائیشیا کا اسلام سافٹ اسلام ہے، جبکہ ایرانی اسلام ہارڈ اسلام ہے یا متشدد اسلام، اسی طرح طالبان کا اسلام، القاعدہ کا اسلام؛ تو اس کا تناظر یہ ہے۔ میرے خیال میں ہمیں اس طرح کی باتوں کے پیچھے کارفرما مقاصد، ان کے معنی اور ان کے نتائج کو سمجھنا چاہیے۔ میں نئی اصطلاحات کا مخالف نہیں ہوں اور بعض اوقات ابلاغ کی غرض سے آپ کو وہ اصطلاحات استعمال کرنی پڑتی ہیں جو آپ کی روایت کا حصہ نہیں ہوتیں، اور جس طرح دوسرے انہیں استعمال کر رہے ہوتے ہیں ہم بھی انہیں اپنی بات کو قابل فہم اور موثر بنانے کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔ مگر سافٹ اسلام کی اصطلاح میرے نزدیک صحیح نہیں ہے، یہ بالکل 'اسلاموفوبیا' اور 'سیاسی اسلام' کی طرح ہے۔ اسلام کی سیاست ضرور ہے مگر 'سیاسی اسلام' نامی کوئی چیز نہیں ہے، اسلام تو اسلام ہے، اس کا ایک اخلاقی پہلو ہے، ایک سیاسی پہلو ہے، عبادات ہیں، اور ایک معاشی پہلو بھی ہے۔ اس لیے 'سیاسی اسلام' کہہ کر آپ صرف یہ بتانا چاہ رہے ہیں کہ جو اس کے لیے کھڑا ہوتا ہے وہ سیدھے راستے سے ہٹ رہا ہے۔ لہٰذا میرے خیال میں ہمیں الفاظ کے اس نازک فرق کو سمجھنا چاہیے، اور میرے نزدیک یہ اصطلاح کا غلط اطلاق ہے۔

تبصرہ اور سوال (پروفیسر راجہ احسان عزیز): آپ نے ایرانی ماڈل، سوڈانی ماڈل اور سعودی ماڈل کی بات کی۔ آپ نے جس طرح ذکر کیا میں اس سے کچھ اختلاف کرنا چاہوں گا۔ میرے خیال میں ایرانی انقلاب اس کے شیعہ فریم ورک کو ذہن میں رکھتے ہوئے ایک بہت بڑی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کامیابی تھی، اور یہ کوئی ایسی چیز نہیں جسے آرام سے نظر انداز کیا جا سکے۔ میرے خیال میں اس نے اس وقت کی دنیا کو ہلا کر رکھ دیا تھا اور اس نے ایک بہت مضبوط اور مستحکم اور لچکدار ریاست کو جنم دیا جہاں دیرپا اسلامی اصلاحات ہوئیں۔ میرے خیال میں یہی چیز ہے جس کی وجہ سے وہ ایک خودمختار ریاست کے طور پر دنیا کے سامنے کھڑے ہیں؛ اور سعودی بھی اپنی بادشاہت کی وجہ سے۔ اور تیسرا ماڈل طالبان ہیں۔ ہوسکتا ہے آپ انہیں پسند نہ کرتے ہوں یا انہیں قدامت پسند سمجھتے ہوں۔ لیکن میں نے افغانستان میں کافی عرصہ کام کیا ہے اور اسے اچھی طرح دیکھا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان کا ماخذ قرآن و شریعت ہے، اور ان کی کامیابیوں کو محفوظ نہیں کیا گیا، انہیں شیطان کے طور پر پیش کیا گیا۔ یہاں تک کہ ان کے سفارتی جوابات۔ مثلاً امریکی دباؤ پر ملاّ عمر کا ردعمل جب اسامہ بن لادن وہاں موجود تھا۔ اور اب بھی وہ نوجوان طیب آغا، اس کا سفارتی ردعمل، ایسی جرأت مندانہ باتیں ہیں جو ہمارا دفتر خارجہ کرنے سے قاصر ہے، آپ اس کا موازنہ نہیں کر سکتے۔ میرے خیال میں ان ماڈلز کو سنجیدگی سے لینا چاہیے۔

جناب، میرا آخری سوال فوج کے کردار کے حوالے سے ہے۔ آپ نے مصری فوج کی بات کی کہ وہ اسلامی تبدیلیوں کی راہ میں حائل ہو رہی ہے۔ مگر پاکستانی فوج کا کیا حال ہے، اس طرف توجہ بھی بہت ضروری ہے۔ پاکستانی فوج نے اسلامی پی این اے تحریک پر تقریباً قبضہ کر لیا تھا جو خود ایک بہت اہم انقلاب کی نشانی تھی۔ ضیاء الحق نے اسے ہائی جیک کیا اور فوجی آمریت کو اسلامی روپ دیا، اور پھر نوّے دن کا کہہ کر اس نے اپنے اقتدار کو طول دیا؛ اور آج، فوج کے لیے تمام تر احترام کے ساتھ، وہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف عالمی جنگ کے اتحادیوں میں سب سے آگے آگے ہیں۔ ان کی روایات مغرب سے لی گئی ہیں، وہ اپنا مارچ الٹے پاؤں سے شروع کرتے ہیں۔ لہٰذا ایک ایسی فوج کے ہوتے ہوئے جس کی جڑیں برطانوی نوآبادیاتی ایسٹ انڈیا کمپنی سے جا ملتی ہوں اور جس کی روایات آج تک چلی آتی ہوں، آپ پاکستان میں اسلامی تبدیلی کی کتنی توقع رکھتے ہیں؟ آپ فوج کے کسی بھی میس میں چلے جائیں اور اٹھارویں اور انیسویں صدی کی تصاویر دیکھیں، مجھے یقین نہیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آ تا۔

جواب: میں آپ سب کا شکرگزار ہوں، آپ میں سے ہر ایک نے اپنے انداز میں مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی، سوالات اٹھائے اور مجھے موقع دیا کہ ان پر اپنی رائے کا اظہار کروں؛ اور یہ ہمارا مقصد تھا کہ ہم تبادلہ خیال کریں تاکہ مستقبل میں مزید مسائل زیر بحث لائے جا سکیں۔

جہاں تک سعودی عرب، ایران اور طالبان سے متعلق سوال کا تعلق ہے تو میں ان لوگوں میں سے ہوں جو ان میں سے ہر ایک کی مثبت باتوں کی تائید کرنے پر یقین رکھتے ہیں۔ اس حوالے سے میں نے یہاں اور بیرونِ ملک بھی ذاتی کوششیں کی ہیں۔

ایرانی انقلاب اور اس کی حمایت کی بات کی جائے تو اس حوالے سے میں ان لوگوں میں تھا جو سب سے آگے تھے۔ ۱۹۶۳ء میں جب ایرانی علماء کی تحریک کا آغاز ہوا اور بادشاہ نے قم میں فوجی طاقت کا استعمال کیا، تو وہ ترجمان القرآن ہی تھا جس نے ان کی بات کی۔ ۱۹۶۴ء میں جب مولانا مودودی کو جیل ہوئی، تو مجھے بھی ان کے ساتھ رہنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ اور جب ہمارے خلاف چھ نکاتی چارج شیٹ بنائی گئی تو اس میں ایک نکتہ یہ بھی تھا کہ ہم پاک ایران تعلقات کو نقصان پہنچا رہے ہیں، کیونکہ ہم اسلامی قوتوں کی حمایت کر رہے تھے۔ میں امام خمینی سے ملا جب وہ پیرس میں تھے؛ میں ابراہیم یزدی سے رابطے میں تھا۔ اور پاکستان جب ایرانی انقلاب کو تسلیم کرنے والا پہلا ملک بنا تو اس میں کچھ حصہ میرا بھی تھا۔ میں ساری رات آغا شاہی، حاشر فاروقی، ابراہیم یزدی اور ضیاء الحق کے ساتھ رابطے میں تھا۔ میں وہاں کئی مرتبہ گیا ہوں اور اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ صرف ایرانی انقلاب نہیں بلکہ اسلامی انقلاب تھا۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ بعد ازاں خیر کے بڑے عنصر کے ساتھ آہستہ آہستہ تنگ نظری اور اعتدال پسندی کا فقدان بھی آ گیا۔ اصل تبدیلی معاملات کو اسلامی اصولوں کے مطابق ڈھالنے کا نام ہے، نہ کہ افراد اور گروہوں کے مفادات کے لحاظ سے۔ ایسے معاملات ہیں جن سے میں کافی غیر مطمئن رہا اور میں نے ان کا اظہار بھی کیا ہے۔ ان کے آئین کی بات کی جائے تو میں اسے بہتری کی جانب بڑی پیش رفت سمجھتا ہوں۔ امام خمینی نے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حکومت الٰہیہ پر ایک کتاب لکھی جس پر میں نے تبصرہ کیا اور لکھا کہ پہلی بار ایک ایسی بات کہی گئی ہے جو ہمارے شیعہ بھائیوں کے امامت کے مروجہ تصور سے مختلف ہے۔ اور اس میں یہ دروازہ کھولا گیا ہے کہ جب تک امام غائب نہیں آتا حکومت کا کام امت انجام دے گی۔ یہ ایک بڑی پیش رفت تھی جس کو سراہا گیا اور یہ آن ریکارڈ ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں ایرانی ماڈل کو اس کی موجودہ شکل میں پوری امت کے لیے مثال کے طور پر نہیں دیکھتا؛ البتہ اس ماڈل اور تجربے سے فائدے حاصل کیے جا سکتے ہیں اور کیے جانے چاہئیں۔

طالبان کی بات کی جائے تو جب وہ اقتدار میں تھے تو میں نے یہ کہا تھا، اور براہ راست بھی کہا تھا، کیونکہ میں یہاں اس وقت افغانستان کے سفیر سے رابطے میں تھا، اور جب وہ آئی پی ایس آتے تو بات چیت ہوتی تھی۔ انہوں نے جو اصلاحات کیں، اپنے علم کے مطابق کیں، اخلاص اور قانون کی نظر میں سب کو برابر رکھ کر کیں، انہوں نے کسی کی طرف داری نہیں کی اور کسی کو غلط طور پر سزا نہیں دی۔ انہوں نے لاقانونیت کا خاتمہ کیا اور تحفظ، امن وامان اور انصاف فراہم کیا، یہ ایک حقیقت ہے۔ انہوں نے ملک کو اسلحہ سے پاک کرنے کا عمل شروع کیا جو ایک بہت مشکل کام تھا، مگر وہ کامیاب رہے۔ مگر تعلیمی اور سماجی و اقتصادی ترقی کے حوالے سے اور سب سے بڑھ کر افغانستان کی آبادیاتی حقیقت جس میں پشتون، ہزارہ، تاجک، ازبک، جنہیں پچھلے دو سو سالوں سے تعاون کے ذریعے نظام کا حصہ بنایا گیا تھا، طالبان نے حکمت عملی میں غلطیاں کیں جن کی وضاحت میں کر چکا ہوں۔ منشیات کی کاشت کے حوالے سے اقوام متحدہ کی ایک رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ ۲۰۰۰-۰۱ء افغانستان کی تاریخ میں پہلا سال تھا جس میں پوست کی کاشت صفر ہوگئی تھی۔ یہ اس لیے کہ طالبان نے عزم کیا اور اسے ایمانداری کے ساتھ نافذ کیا۔ طالبان کے اس تجربے میں اچھے اور برے دونوں پہلو ہیں، مگر یہ کہنا کہ وہ ہمارے لیے ایک ماڈل ہے، میں اس سے اتفاق نہیں کرتا۔ میرا خیال ہے ہمیں مثبت کو سامنے رکھنا چاہیے اور منفی سے اپنے آپ کو بچانا چاہیے۔ ہمیں اپنے حالات اور ضروریات کو دیکھنا چاہیے، اور اس اصل مثالیے کو جو اسلام نے ہمیں دیا ہے، اسی ماڈل کی روشنی میں آگے بڑھنا چاہیے، وہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے صحیح ماڈل۔

جہاں تک فوج کے کردار کا تعلق ہے یہ میرا مضمون نہیں مگر جب بات چیت میں یہ سامنے آتا ہے تو میں مصر کے تناظر میں بات کرتا ہوں۔ لیکن میں آپ سے مکمل اتفاق کرتا ہوں کہ صرف فوج ہی میں نہیں بلکہ آپ کی بیوروکریسی، آپ کے پورے نظام، حتیٰ کے عدالت میں بھی بنیادی تبدیلیوں کی ضرورت ہے؛ رویوں، ڈھانچوں اور طریقہ کار میں تبدیلی۔ ہم نے کئی اہم طریقوں سے کوشش کی، مثلاً اسلامک یونیورسٹی، شریعت اکیڈمی، انہوں نے ٹریننگ کے لیے پروگرام تشکیل دیے۔ میرے خیال میں وہ صحیح سمت میں جارہے ہیں، مگر یہ بالکل سمندر کنارے سے پتھر چننے کے مترادف ہے، یہ اس سے زیادہ کچھ نہیں کرسکتے۔ نظریاتی اور سیاسی اعتبار سے ہماری فوج کا کردار مجموعی طور پر منفی رہا ہے؛ اسے ٹھیک کیے جانے کی ضرورت ہے۔ میں آپ کو یاد دلانا چاہوں گا کہ میں نے جنرل ضیاء الحق کو سب کے سامنے اور آپس میں ملاقات کے دوران کہا تھا کہ اسلامائزیشن کا جو طریقہ آپ نے اختیار کیا ہے وہ ٹھیک نہیں ہے۔ ان کے اسلامائزیشن کے نقطہ نظر سے میں نے اختلاف کیا تھا۔ میں نے یہ ان کی موجودگی میں بھی کہا، ان کے زمانے میں یہ باتیں میں نے لکھیں اور ان کا اظہار کیا۔ ایک جملہ جو میں نے ان سے کہا تھا وہ میں آپ کو بتانا چاہوں گا۔ میں نے کہا کہ اگر آپ اسلامائزیشن میں واقعی سنجیدہ ہیں تو پھر یہ عمل فوج سے شروع کریں، یہ آپ کا حلقہ ہے اور یہاں آپ کا اثر سب سے زیادہ ہے، مگر انہوں نے ایسا کوئی قدم نہ اٹھایا۔ لہٰذا یہ تمام معاملات ہمارے سامنے ہیں۔ مگر اس کے ساتھ ہی اس بات میں بھی شک نہیں کہ فوج ایک بہت اہم ادارہ ہے، عالمی اور خطے کی صورت حال کو ذہن میں رکھتے ہوئے ہم اسے کمزور نہیں دیکھنا چاہیں گے۔ مگر جو منفی کردار انہوں نے ادا کیا ہے، اور ان کی ٹریننگ میں جو خامیاں ہیں، اور وہ حدود جن کے اندر رہتے ہوئے ان کو کام کرنا چاہیے، ہمیں ان سب باتوں پر نظر رکھنی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں جب بھی اقتدار دیا ہم ان شاء اللہ ان سب جگہوں میں اصلاحات اور تبدیلیاں لے کر آئیں گے۔ شکریہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

صدارتی کلمات (اکرم ذکی):

خلاصے کے طور پر میں کہنا چاہوں گا جب دہشت گردی کی بات کی جاتی ہے تو ہماری کمزوری اور طاقت کی کمی اور ان کی قوت کا ذکر کیا جاتا ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کمزور کی حکمت عملی گوریلا جنگ اور ناامید کا طریقہ دہشت گردی ہوتی ہے۔ اگر فلسطین اور کشمیر کو ناامیدی کی طرف نہیں دھکیلا جاتا تو وہ دہشت گردی نہ ہوتی جس کی طرف مغرب اشارہ کرتا ہے۔ اس سے پہلے ہم اسے آزادی کی جنگ کہتے تھا مگر مشرف نے، مغرب سے اپنے تعلقات بڑھانے کی غرض سے، انھی کی اصطلاح استعمال کرتے ہوئے، اس کو اس طرح سے دیکھا کہ ہماری تحریک آزادی دہشت گردی بن گئی۔ اس لیے بات چیت اب ہمیں دہشت گردی اور مذمت کی طرف لے جارہی ہے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ نظریاتی لحاظ سے اور دنیا کو صحیح تصویر دکھانے کے لیے جنگ آزادی اور دہشت گردی میں فرق ضرور کرنا چاہیے۔ ایرانی انقلاب کی بات کی جائے تو میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ شیعہ اور سنی کے فرق کے باوجود اس نے پوری مسلم دنیا پر اثر ڈالا ہے۔ آج عرب بہار اور عرب تحریک آزادی کے حوالے سے جو کچھ کہا گیا یقیناً اس سے متاثر ہوا۔ علامہ اقبال پر بھی کئی جگہ بات ہوئی، اقبال نے بھی بیداری کے لیے راستہ استوار کیا۔ آگے بڑھنے سے پہلے میں کہنا چاہوں گا کہ پروفیسر صاحب نے سابق سامراجی نظام یا غلامی کے دور کی بات کی اور نو سامراجی نظام کی طرف بھی اشارہ کیا۔ پرانے سامراجی نظام کی بات کی جائے تو مغرب اس طرف واپس جانے کا ارادہ رکھتا ہے، اس کی خواہش ہے کہ وسائل پر اس کا قبضہ رہے؛ اس کی خاطر اس نے ایسے لوگ تیار کیے جو یہاں اور دوسرے ممالک میں بھی اس کے نقش قدم پر چلتے رہیں۔ اس نے جاگیردار تیار کیے اور انہیں زمینوں سے نوازا، اس نے سول-ملٹری بیوروکریسی تیار کی اور انہیں اپنی زبان اور اپنا انداز فکر سکھایا۔ واپس جانے کے بعد انہوں نے جب ہمیں ٹیکنالوجیکل آزادی دی تو عوام کو اس سے محروم رکھا۔ اور اس کے بجائے اسے انھی لوگوں کے حوالے کیا اس امید کے ساتھ کہ وہ اس تعاون کو برقرار رکھیں گے، اور پھر انہیں عسکری اور اقتصادی امداد فراہم کی۔ اس نے پھر ایک نئے طبقے، بزنس کلاس، کو اپنے ساتھیوں کے طور پر تیار کیا۔ ہمارا جو مذہبی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

طبقہ تھا وہ غربت کا شکار تھا اور نفس کشی کے ذریعے انہوں نے اپنے مذہب اور ثقافت کو برقرار رکھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ترقی نہ کر سکے اور جمود کا شکار ہو گئے اور اسی طرح رہ گئے جیسے نوآبادیاتی دور میں تھے جہاں کوئی نئی اور تخلیقی سوچ نہیں تھی۔ مگر بعدازاں سرسید احمد خان اور اقبال جیسے لوگوں نے احیاء کی تحریکوں کا آغاز کیا؛ مولانا مودودی اور دوسرے مفکرین نے بھی اپنا کردار ادا کیا۔ اس حوالے سے علامہ اقبال فرماتے ہیں:

عطا مومن کو پھر درگاہ حق سے ہونے والا ہے
شکوہ ترکمانی، ذہن ہندی، نطق اعرابی

لہٰذا آج پھر ہم وہ دیکھ رہے ہیں۔ 'ذہن ہندی'، کو دیکھیں تو علامہ اقبال کا فلسفہ، مولانا مودودی کی تحریریں اور سرسید احمد خان کی کامیابیاں ہمارے سامنے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ ہم نے تحریک پاکستان کا آغاز کیا اور اس میں کچھ نظریاتی عناصر بھی تھے۔ 'نطق اعرابی' عرب نوجوان طبقے کی مغرب اور مغربی رہنماؤں کے خلاف بغاوت، جبکہ 'شکوہ ترکمانی'، آپ دیکھیں گے وہ ترکی ہی تھا جس نے اسرائیل کے خلاف اپنا بحری بیڑہ بھیجا، اور اب مغرب سے مایوس ہونے کے بعد وہ مشرق کی جانب دیکھ رہا ہے اور اس کی عظمت کا دور پھر شروع ہو چکا ہے۔ اس لیے جب علامہ اقبال نے یہ مانا تھا کہ دنیا میں ہمارے خطے کے لوگ ذہین ہیں تو ہمارا فرض بنتا ہے کہ اب جبکہ ایک نیا باب کھل چکا ہے تو نظریاتی طور پر ہم ان مسائل پر غور کریں اور اپنے لیے نئی راہیں تلاش کریں۔

امت کے حوالے سے میں ایک بات کا اضافہ کرنا چاہوں گا جسے نظر انداز کیا جا رہا ہے۔

۱۹۶۹ء میں جب بیت المقدس کی توہین کی گئی، ہم مسلمان ایک ساتھ جمع ہوئے اور بیدار ہو گئے، اور ایک تنظیم بنائی۔ پروفیسر صاحب نے بھی اسے ایک بحث کرنے والا فورم قرار دیا ہے، اور ہمیں بھی معلوم ہے کہ یہ عملی اعتبار سے کمزور ہے۔ جب بھی رہنما آپس میں ملتے ہیں تو نشستند، گفتند، برخاستند والا معاملہ ہوتا ہے۔ مگر تین کمیٹیاں ایسی بنائی گئی ہیں جو کام کر رہی ہیں، اور میرے خیال میں ان کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ ایک تکنیکی اور سائنسی تعاون کی کمیٹی ہے جسے کامسٹیک (COMSTECH) کہا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جاتا ہے، اوراس کی سربراہی پاکستان کے پاس ہے کیونکہ وہ اس شعبے میں آگے ہے۔ اور ترقی کی رفتار کو بڑھانے کے لیے امت یکجا ہو کر اس کے ساتھ تعاون کر رہی ہے۔ دوسری تجارتی اور اقتصادی کمیٹی ہے جس کا سربراہ ترکی ہے اور وہ بھی اپنا کام کر رہی ہے؛ اور تیسرے ثقافتی اور تعلیمی کمیٹی ہے جس کی سربراہی سینیگال کے پاس ہے، اس شعبے میں بھی باہمی بات چیت جاری ہے اور پس پردہ باہمی منصوبہ بندی پر کام کیا جارہا ہے۔

ایک اہم چیز جس کا ذکر پروفیسر صاحب نے کیا وہ یہ کہ ایٹم بم کے برے پہلوؤں کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے اس نے کسی بڑی جنگ کے امکانات کو ختم کر دیا ہے۔ جب فریقین کے پاس ایٹم بم ہو تو ایسے میں جنگ نہیں ہوا کرتی، لیکن اگر صرف ایک کے پاس ہو تو تاریخ اس کے استعمال پر شاہد ہے اور اس کے مستقبل میں بھی امکانات ہیں۔ آپ نے سوال اٹھایا کہ ہمارے عرب بھائی کیا کر رہے ہیں، تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس ایٹم بم کو بنانے میں انہوں نے ہماری کسی نہ کسی طرح مدد ضرور کی ہے۔ تکنیکی تعاون کے شعبے میں جو کمیٹی کام کر رہی ہے اس میں سب اپنا حصہ ڈال رہے ہیں۔ لہٰذا امت کے احیاء کی بنیاد پڑ چکی ہے؛ نظریاتی، سیاسی اور اقتصادی میدانوں میں تعاون کی راہیں کھل چکی ہیں اور ثقافتی تعاون بھی بڑھ رہا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ سیاسی لحاظ سے یہ تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں اور جب نئی قیادت منظر عام پر آئے گی تو ہم اس تصادم سے کیسے نمٹیں گے؟ ہنٹنگٹن اور لیوس کا ذکر کیا گیا، مگر اس کے جواب میں ایرانی صدر خاتمی نے ایک تصور پیش کیا تھا کہ 'تہذیبوں کے تصادم' کے بجائے 'تہذیبوں کے درمیان مکالمہ' ہونا چاہیے۔ اور اس مکالمہ اور بات چیت کے نام پر عالمی سطح پر بہت سی تنظیمیں بھی بنائی گئی ہیں۔ اقوام متحدہ بھی مکالمہ اور ڈائیلاگ شروع کرنے کے لیے کوشاں ہے، گو کہ اس کے پیچھے اس کے اپنے مقاصد ہیں۔ اس طرح بین الاقوامی سطح پر اس بات پر توجہ دی جارہی ہے کہ تہذیبوں کے درمیان مذاکرات ہوں۔ آج کی بحث میں مجھے صرف ایک بات کی کمی محسوس ہوئی۔ ہم نے اسلام اور مغرب کی بات کی؛ اصل میں یہ دیکھا گیا ہے کہ پچھلے ۵۰۰ سالوں میں مغرب نے دوسری تمام

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تہذیبوں کو مغلوب کرنے کی کوشش کی ہے۔ مغربی اور غیر مغربی کا سوال اب بھی رہتا ہے؛ اس کے باوجود اسلام کا غیر مغربی تہذیبوں پر ایک گہرا اثر ہونا چاہیے اور ان کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کرنے چاہئیں۔ اس بارے میں ہنٹنگٹن خود اس کا بالواسطہ اعتراف کرتا ہے کہ اگلی صدی میں جب تصادم ہوگا تو کنفیوشیس تہذیب اور اسلامی تہذیب، مغربی تہذیب کے خلاف صف آراء ہوں گی۔ میرے خیال میں اس کا عملی ثبوت یہ ہے کہ کس طرح پچھلے ساٹھ سالوں میں چین سے ہمارا رشتہ استوار ہوا ہے اور چین نے ترقی کی ہے، اور جس کے باعث اقتصادی طاقت کا مرکز بحر اکاہل سے بحر اوقیانوس منتقل ہو گیا ہے؛ اس کے ساتھ ہی ایشیائی صدی کی داستان بھی۔ اس طرح اسلام اور کنفیوشیس تہذیب کے درمیان تعاون اس تصادم کا سامنا کرنے اور اس کا مقابلہ کرنے کا ایک راستہ ہے، اور انہیں یہ بتانے کا ذریعہ بھی کہ ہم اتنے بے بس نہیں جتنا وہ ہمیں سمجھتے ہیں۔

دہشت گردی کا علاج اس وقت تک ممکن نہیں جب تک وہ مسائل جن کا ذکر پروفیسر صاحب نے کیا جیسے فلسطین، کشمیر اور چیچنیا میں انصاف نہیں کیا جاتا اور وہاں کے لوگوں کو آزادی نصیب نہیں ہوتی۔ ناانصافی پر مبنی کوئی بھی چیز پائیدار نہیں ہو سکتی۔ ۲۰۰۱ء سے میرا نقطہ نظر یہ رہا ہے کہ جب ۱۰۹۶ء میں پوپ نے صلیبی جنگ کا اعلان کیا تھا اور دونوں کے درمیان اگلے ۲۰۰ سے ۳۰۰ سالوں تک کے لیے تصادم کا ایک راستہ کھولا تھا؛ اسی طرح 'وار آن ٹیرر' کا آغاز کر کے امریکہ نے بھی اس جن کو بوتل سے باہر نکال دیا ہے، اور جسے وہ دہشت گردی سمجھتے ہیں وہ اس جنگ کے ساتھ ختم نہیں ہوگی۔ بلکہ تیسری دنیا میں ہزاروں تحریکیں جنم لیں گی اور ہزارہا نوجوان ان میں شامل ہو کر مغرب کی ناانصافی کے خلاف آواز اٹھائیں گے۔ وہ اسے دہشت گردی کا نام دیں یا کچھ اور کہیں، مغرب کے خلاف یہ تصادم اب اگلے دو، تین سو سالوں تک جاری رہے گا۔ اگر ہم اسلام کے فلسفے کو مثبت انداز میں اختیار کریں گے تو اس کا کردار بڑھے گا، ورنہ کوئی اور فلسفہ جو اپنے آپ کو صحیح ثابت کرے گا اور زیادہ نظم وضبط کا مظاہرہ کرے گا، وہی ترقی پائے گا، اور یہی تاریخ کا طریقہ کار ہے۔

اختتام کرنے سے پہلے میں ایک ایس ایم ایس سنانا چاہوں گا جو مجھے بہت سے منفی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پیغامات کے برخلاف موصول ہوا:

''جو تم چاہتے ہو وہ نہیں ہوتا، ہوتا وہی ہے جو خدا چاہتا ہے، اگر تم وہ کرو جو خدا
چاہتا ہے، تو وہی ہو گا جو تم چاہتے ہو۔''

اس کے ساتھ ہی میں آپ سب کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گا، خصوصاً پروفیسر صاحب کا اور ہمارے دونوں مہمانوں کا جنہوں نے بہت اچھے سوالات اٹھائے۔

© rasailojaraid.com